RegdL. No.7243
Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1981

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا، تیرے بعد!

(اندر۔ صفحہ ۲۔۳)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور
قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۰ روپے (رجسٹرڈ بحری ڈاک)	ٹیلی فون ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۳ تین روپے
جلد ۳۴	جولائی سنہ ۱۹۸۱ء	شمارہ ۷

فہرست

۱۔ کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے ! ۲

۲۔ لمعات — روزوں کا مقصد ۴

۳۔ مشینی انسان اور قرآنی نظام ۱۰

۴۔ تقدیر کی گرہیں — خدا اور انسان کا تعلق ۳۶

۵۔ علماء کون ہیں ؟ ۵۰

[illegible]

کوئی دِن اَور بھی جیئے ہوتے!

ہم دونوں ایک ہی شہر، بلکہ ایک ہی محلہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن یہ تو کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہو۔ ایک شہر اور ایک محلہ تو ایک طرف، ایک گھر کے رہنے والے بھی، اس قدر یگانے ہونے کے باوجود بیگانے کے بیگانے رہتے ہیں۔ لیکن ہم بیگانے ہونے کے باوجود، اس قدر یگانے تھے کہ اس یگانگت کی مثال نہیں ملتی۔ مزاج اور طبائع کی موافقت، فکر و نظر کی ہم آہنگی، ذوق و شوق کی یک رنگی، تصوراتِ زندگی اور مقاصدِ حیات کی یکسانیت۔ احساسات و جذبات تک میں مطابقت۔ یوں کہئے گویا ہم دونوں ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ ابتدائی دور کو چھوڑ کر، پچاس سال سے اوپر تک کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ایسی رفاقت جس میں خلا تو کجا، ذرا سے اختلاف تک کا بال نہ آیا۔ ایسے رفیق کا تعارف میں کن الفاظ سے کراؤں؟ اسے دوست کہوں، بھائی کہوں، بزرگ کہوں، ہمشیر کہوں، غمخوار کہوں، ہم سفر کہوں، ہم دوش کہوں، ہم زبان کہوں۔ لیکن یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے لئے جو کچھ تھے، الفاظ اس کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔ اس مقام پر تو امیر خسروؒ کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔ اما تو چیزے دیگری! یوں سمجھئے جیسے ہماری دو آنکھوں سے نکلی ہوئی دو نگاہیں اس طرح ایک ہو جاتی ہیں کہ انہیں نگاہیں نہیں کہا جاتا، نگاہ ہی کہا جاتا ہے۔ بس کچھ ایسی ہی تھی ہماری کیفیت۔ اس یگانگت کی بنیاد تھی، قرآن سے عشق، اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے والہانہ عقیدت اور تحریک (اور اس کے بعد خود) پاکستان سے جنون کی حد تک وابستگی۔ اس منزل کے لئے ہم سفری کا آغاز ۱۹۳۰ء سے ہوا جب علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے خطبہ میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ ہم اسی زمانے کے "پاکستانی" تھے۔ جب قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کی عملی تشکیل کی تو اس کی ترجمانی کے لئے ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔ اس کے نظم و نسق کا شعبہ اسی رفیق کے سپرد تھا۔ تحریکِ پاکستان ہندو اور انگریز دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا اور طلوعِ اسلام اس کا نقیب۔ اور ہم اس حکومت کے ملازم جو ہندوؤں اور انگریزوں پر مشتمل تھی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ طلوعِ اسلام کے ساتھ اس قسم کی وابستگی کتنے بڑے خطرہ کا موجب تھی۔ لیکن، بڑے عقل میں اہلِ جنوں کی تدبیریں۔ میں سرکاری کوارٹروں میں رہتا تھا اور طلوعِ اسلام کا دفتر میرے ہی مکان میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے تو ہم دونوں یکساں ہیں لیکن تمہارے کوارٹر میں طلوعِ اسلام کا دفتر زیادہ قابلِ اعتراض قرار پا سکتا ہے۔ یہ کہا اور اس کا دفتر اٹھا کر اپنے ذاتی مکان میں لے گئے جو قرول باغ (دہلی) میں واقع تھا۔

اس جنون کی جولانگاہیں، فضائے طلوعِ اسلام سے ماورا بھی تھیں۔ دہلی اور اس کے ارد گرد کے شہروں میں جہاں مسلم لیگ کا اجلاس ہوتا اسی پنڈال میں "بیادِ اقبالؒ" ایک تقریب کا اہتمام کر لیا جاتا۔ دفتر سے چار بجے اٹھتے۔ بھاگم بھاگ وہاں پہنچتے۔ ان کی آواز رسیلی بھی تھی اور پُرسوز بھی۔ وہ اقبالؒ کا کلام پیش کرتے تو سامعین مسحور ہو جاتے۔ اس کے بعد میرا خطاب ہوتا۔ اور ہم پھر دوسرے دن دفتر میں موجود ہوتے۔ اس آگ سے کھیلنے کی انتہا یہ تھی کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ کا انقلابی اجلاس منعقد ہوا تو اس کے پنڈال کے ساتھ طلوعِ اسلام کا خیمہ نصب تھا جو اربابِ لیگ کی گویا مشاورت گاہ تھا۔ اس کے کرتا دھرتا بھی وہی تھے۔

تقسیمِ ہند کے بعد میں کراچی میں تھا۔ وہ لاہور آ گئے۔ اپنے مکان کے دیوار بدیوار (محترم میرزا محمد خلیل کے تعاون سے) میرے لئے ایسا مکان بنوایا جو میری رہائش گاہ کے علاوہ تحریکِ طلوعِ اسلام کا مرکز بھی بن سکے۔ اور اس طرح میں ۱۹۵۵ء میں لاہور منتقل ہو کر آ گیا۔

ہم دونوں ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اس لئے اب سارا وقت اسی جنون کے لئے وقف تھا۔ قرآنی درس گاہ اور ریسرچ سنٹر کا تصور تو بے شک میرے ذہن کی تخلیق تھا لیکن اس کی عملی اسکیم انہی کے فکر و تدبّر کی رہینِ منت تھی۔ انہی کے لئے قرآنک ایجوکیشن

سوسائٹی کا وجود عمل میں لایا گیا۔ وہ عمر بھر میرے ہم سفر اور ہم قدم رہے لیکن نمود و نمائش سے اس قدر محترز کہ تاکید تھی کہ ان کا نام نمایاں طور پر سامنے نہ آنے پائے۔ لیکن میرے اصرار پر انہوں نے قرآنک سوسائٹی کی سیکرٹری شپ قبول فرمالی۔ اور پھر دن رات اسی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے!

یہ تھے میرے وہ زندگی بھر کے ساتھی جو

شیخ سراج الحق

کے نام سے متعارف تھے۔ شرافت کے مجسمہ۔ دیانت و امانت کے پیکر۔ زندگی آب گہر کی طرح شفاف اور سفیدۂ سحر کی طرح بے داغ۔ ان کے سینے میں کسی کے خلاف، عداوت۔ نفرت۔ بغض۔ کینہ یا کدورت کا غبار تک نہ تھا۔ جھوٹ یا ریاکاری کے الفاظ ان کے لغتِ زندگی میں نہ تھے۔ میں نے اس پچاس سالہ رفاقت میں ان میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جسے لغزش کہا جاسکے۔ وہ اقبالؒ کے اس مردِ مومن کا زندہ پیکر تھے جس کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　بزم ہو یا رزم ہو، پاک دل و پاکباز

وہ گذشتہ قریب دو سال سے دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ ہم ان کی زندگی سے نا امید ہو گئے لیکن وہ ہر بار، ان طوفانوں سے صحیح سلامت نکل آتے۔ اس واپسی پر وہ اسی حسین و لطیف مسکراہٹ کے ساتھ جو ان کے شگفتہ و بشاش چہرے کا جزو بن چکی تھی اور جو درحقیقت مظہر تھی ان کے جذبۂ پُر امیدگی کی، مجھ سے کہا کرتے کہ۔ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔ اور میں جواب میں کہتا کہ ——— ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا۔ لیکن اس طرح موت کی کب تک ہنسی اڑائی جاسکتی تھی؟ $\frac{14}{15}$ جون کی درمیانی شب جو وہ گئے ہیں تو پھر نہیں لوٹے۔ اندھی موت کا پنجۂ سخت گیر رہا۔

ہم عمر بھر اپنی آنکھوں سے دنیا کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں لیکن آنکھوں کی موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ جب بینائی جاتی رہے تو اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ آنکھیں کیا نہیں؟ وہ موجود تھے تو مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ اب جو وہ مجھ سے چھین گئے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ میرے لئے کیا تھے؟ اب پتہ چلا کہ وہ تو میری زندگی کا سہارا تھے۔ وہ میرے جینے کا آسرا تھے۔ وہ میری متاعِ حیات تھے۔ ان کے جانے سے یہ سب کچھ چلا گیا!

ان کے بڑے بیٹے عزیزم (بریگیڈیر انعام) نے مجھے (ان کی وفات کے بعد بتایا کہ) ۱۴ جون کو ناشتہ کے میز پر بیٹھے اس سے کہنے لگے کہ بیٹا! آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ چودھری چاچا جی کو بلاؤ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ زندگی کا سفر ہم دونوں اکٹھے طے کرینگے۔ میں ان سے معذرت کرنا چاہتا ہوں کہ میں اب تھک چکا ہوں۔ مجھ میں مزید سفر کی ہمت نہیں۔ اس لئے میں اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکونگا۔ مجھے معاف کردو! عزیزم انعام نے مجھ سے کہا کہ میں نے سوچا کہ اگر آپ آگئے تو اباجی کے سینے میں جذبات کا ایسا طوفان امنڈ آئیگا کہ وہ ان کا جان لیوا ثابت ہو جائیگا۔ اس لئے میں نے ٹال دیا۔ بیشک مصلحت کا تقاضا وہی تھا جو عزیز موصوف نے کیا لیکن میرے دل کی آواز یہ کہتی ہے کہ اگر مجھے بلا لیا جاتا تو میں ان سے کہتا کہ جہاں آپ نے اتنا لمبا سفر میری خاطر طے کیا ہے، دو چار قدموں کی اور زحمت برداشت کرلیجئے۔ میں نے یہاں کونسا بیٹھے رہنا ہے! اکٹھے ہی چلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات کو نہ ٹالتے۔ انہوں نے عمر بھر میری ..... کسی بات کو نہیں ٹالا تھا! لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اب میں ان سے کیسے کہوں کہ کوئی دن اور بھی جئے ہوتے!

شام میں ...

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥

لمعات

روزوں کا مقصد

(بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم)

پرویز

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (۲/۱۸۳) "اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں"۔ یہ "کتاب" یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳) لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۲/۱۸۵) اور وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ۔ (۲/۱۸۵)

تَتَّقُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تشکرون، سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا۔ اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکمِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا۔

لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ

سب سے پہلے لفظ "کبریائی" کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ، فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں یعنی یہ کہ تَکُوْنَ لَکُمَا الْکِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ (۱۰/۷۸) "تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے"۔ اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

(٥)

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شئے کو مجالِ انحراف نہیں۔

یا رائے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔" دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (۴۳/۸۴) "وہی آسمانوں میں بھی صاحب اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحب اقتدار۔" (الٰہ کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود نہیں بلکہ انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی اُمت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ یٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشن کائنات بہار نو کا مظہر بن جائے گا۔ (المدثر کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ "اٹھ اور نوع انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے۔" وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱-۳)۔ "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو"۔ —— یہ تھا منصب رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے۔ لیکن یہاں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ۔ "حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔" اور اس سے آگے ہے: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔ (۱۷/۱۱۱) "لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو۔" اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ اَلْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) کہا ہے۔ کہیں اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) اور کہیں اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ (۲۲/۶۲) ہماری دنیا میں وہ اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہو گی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ —— اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہو گی اُسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۰)

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔

جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اُلٹ کر اُس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں الْأَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۹) "اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے"۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآنِ کریم نے إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ "یعنی اگر تم مومن ہو گئے تو"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ اَلْاَعْلٰی میں نہیں۔ سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ——— اَلْاَعْلٰی کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں، جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی نہترا نبت ہے، مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے حق پہ مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:-

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔ (۷/۱۴۶)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے۔ اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

———— (۰) ————

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ۔ صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (سنہ ۲ ھ میں) روزے فرض ہوتے، اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ — لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آجکل مستقل فوج سے الگ ——— (RESERVISTS) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں

کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی، اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی"۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (۱۰/۵۸)۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو، یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا، جسے عیدالفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ قرآن، خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پالنے پر جشنِ مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا با ترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو"۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم، خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس "بڑائی بیان کرنے" کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نمازِ عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ، یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر، اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے بصد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں — کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اَللّٰهُ اَكْبَرُ

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی "شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں، میرا خیال یہ ہے۔ یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابلِ قبول ہونا تو درکنار اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشہد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے"۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ "اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں"۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ۔ "ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے"۔ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳/۱۸) "خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے"۔

آپ نے غور فرمایا کہ ——— قرآن کریم کی رو سے اللہ اکبر کہہ کر کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

(۰)

(یہ ہوتا ہے انداز محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا۔ یہ درس ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور، میں ہر جمعہ کی صبح بالمشافہ ہوتا ہے، اور مختلف شہروں کی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام "ٹیپ ریکارڈر" پر۔ انفرادی طور پر حسبِ فرمائش، ان درسوں کے ٹیپ (CASSETTES) بھی مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)۔

(۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشینی انسان ــــ اور ــــ قرآنی نظام

پرویز

یہ واقعہ ہے مملکتِ خداداد پاکستان کے دارالسلطنت، اسلام آباد کا، جسے احمد تشہیر صاحب نے، ڈوبتے ہوئے دل، کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ لکھا ہے اور روزنامہ ڈی مسلم کی اشاعت بابت ۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا رواں ترجمہ ملخصاً درج ذیل کیا جاتا ہے، متعلقہ نام احتیاطاً حذف کرتے ہوئے۔

وہ ایک ممتاز خاندان کی نہایت ہونہار بچی تھی۔ آرٹ کی طالبہ۔ والدہ اہلِ قلم۔ والد ادیب بھی اور شاعر بھی۔ اور اس کے ساتھ حکومتِ پاکستان کی طرف سے، ہندوستان میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز۔ بچی نے تین دن بعد، اپنی بیسویں سالگرہ منانے کے لئے اپنے ابو کے پاس جانا تھا کہ اسے بخار آیا، اور ۸ اپریل کی شام حالت اچانک بگڑ گئی اور اس حد تک کہ معالج نے، جو خود ایک ماہر ڈاکٹر تھے، فیصلہ کیا کہ اسے فوراً آکسیجن ملنی چاہیئے۔ اسلام آباد کے پاک ٹیکنیک ہسپتال میں لیبارٹری نہیں۔ اس کے لئے نیشنل ہیلتھ لیبارٹری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ وہ لیبارٹری دو بجے بند ہو جاتی ہے اور اس وقت ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مریضہ کی والدہ کار میں بیٹھیں۔ بچی کو اپنی گود میں لٹایا۔ اور اس کے چھوٹے بھائی، اور ڈاکٹر کے ہمراہ، تیزی سے ..... ہسپتال، راولپنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ مریضہ کی کشمکشِ موت و حیات میں اضافہ کئے جا رہا تھا، اس بیم و رجا کے عالم میں یہ مسافت خدا خدا کر کے طے ہوئی۔ چھ بج کر دس منٹ پر ان کی کار، (M. I. ROOM.) کے سامنے کھڑی تھی۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ مریضہ کو ایک ثانیہ کی تاخیر کے بغیر آکسیجن مل جائے، لیکن

اور یہی وہ "لیکن" ہے جس کے لئے ہم نے اس جانگداز واقعہ کو اپنے ہاں پیش کرنے کی ضرورت سمجھی ہے۔ وہ لیکن یہ ہے کہ ہسپتال کے اس وقت کے انچارج نے کہا کہ مریضہ چونکہ (CIVILIAN) ہے اس لئے اسے ویسے ہی داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے پہلے فلاں فلاں فارم پُر کرنے ہوں گے۔ اتنی رقم پیشگی جمع کرانی ہو گی۔ اس کے بعد متعلقہ اتھارٹی کی اجازت سے مریضہ کو داخل کیا جا سکے گا۔

مریضہ زندگی کے آخری سانس گن رہی تھی۔ حرماں نصیب ماں، اسے اپنی گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے اس کی ڈوبتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر مایوسی کے آخری لمحات میں اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔ اس کا بھائی (FORMALITIES) کی تکمیل کے لئے اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ چھ بج کر پچاس منٹ پر خدا خدا کر کے یہ مراحل طے ہوئے تو انچارج صاحب نے ملازموں سے کہا کہ مریضہ کو اندر لے آؤ۔ وہ کار کے قریب پہنچے لیکن مریضہ بچی لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی ماں کو الوداعی سلام کر کے پہلے ہی جا چکی تھی۔

ہسپتال کی انتظامیہ مطمئن تھی کہ انہوں نے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی نہیں ہونے دی!

(۰)

اور یہ بھی اسی اسلام آباد کا واقعہ ہے۔ وقاص شاہین، ایک چھوٹا سا بچہ خون کے سرطان کے مہلک مرض کا شکار ہے جس کا پاکستان میں علاج نہیں ہو سکتا۔ غریب باپ کی فریاد کسی نہ کسی طرح، صدرِ مملکت کے کانوں تک پہنچ گئی اور انہوں نے، وزیر صحت کے مشورہ کے بعد، ازراہِ شفقت اور ہمدردی، حکم صادر فرمایا کہ بچے کو سرکاری اخراجات پر علاج کے لئے باہر بھیج دیا جائے۔ اس پر اس مریض کے نام کا فائل کھل گیا۔ یہ فائل، ایوانِ حکومت کی غلام گردشوں میں چکر لگا رہا ہے ـــــ کبھی ایک منسٹری میں، کبھی دوسری میں۔ فائل چکر پر چکر کاٹ رہا ہے اور بچے کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ غریب باپ ایک ایک کی منتیں کر رہا ہے۔

یہ خبر، روزنامہ دی مسلم کی ۶ مئی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں اس کے بعد اس فائل اور اس بچے پر کیا بیتی؟

(۰)

ہم نے نہ تو پہلا واقعہ اس لئے درج کیا ہے کہ متعلقہ ہسپتال کے ذمہ دار اربابِ انتظامیہ کے رویہ کے خلاف کوئی شکایت کی جائے۔ اور نہ ہی دوسرا واقعہ، اس لئے کہ متعلقہ محکموں کے جہانِ سنگ و خشت میں انسانی قلب کی تلاش کی جائے۔ ہم نے ان واقعات کو (جو اسی قسم کے سینکڑوں واقعات کی مثالیں ہیں) کسی اور مقصد کے لئے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔

ان واقعات کے ذمہ دار نہ تو متعلقہ ہسپتال کے اربابِ بست و کشاد ہیں اور نہ ہی ان محکموں کے اربابِ

ط ۲۸ مئی ۱۹۸۱ء کے "دی مسلم" میں یہ خبر چھپی ہے کہ اس بچے کی حالت بے حد نازک ہو چکی ہے اور فائل ابھی تک، سٹیپنگ کی طرح، دفاتر کی لامتناہی فضاؤں میں گھوم رہا ہے۔ صدرِ مملکت نے کہا تھا کہ بچے کے باپ کو، جو سرکاری ملازم ہے، کسی ایسے ملک میں تعینات کر دیا جائے جہاں اس کے بچے کا علاج ہو سکے۔ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ سوچئے کہ جس نظام میں صدرِ مملکت کے حکم کی تعمیل اس طرح ہوتی ہو، وہاں عام معاملات کا حشر کیا ہوتا ہوگا!

حل و عقد۔ اس کا ذمہ دار ہے وہ نظامِ حکومت جسے بیوروکریسی کے (BUREAUCRACY) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ اور اس کا (غلط العوام ترجمہ) "نوکر شاہی" آپ نے سینکڑوں بار پڑھا اور سنا ہوگا لیکن اس کے مفہوم یا مطلوب پر کم غور کیا ہوگا۔

بیوروکریسی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی نئی مشین باہر سے آتی ہے تو اس کے ساتھ ایک پمفلٹ ہوتا ہے جس میں اس مشین کے کل پرزوں کی تفصیل درج ہوتی ہے اور یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ مشین میں فلاں نقص پیدا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ اس مشین کا اپریٹر اس مشین کو چلاتا رہتا ہے اور اگر اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو جھٹ سے پمفلٹ کھول کر متعلقہ ہدایات کا مطالعہ کرتا اور ان کے مطابق مشین کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس سارے عمل میں ایک بات قابلِ غور ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسا کرتے وقت اس کا صرف دماغ کام کرتا ہے۔ اس کے دل کا اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دل کا واسطہ انسانوں سے ہوتا ہے، مشینوں سے نہیں۔

مغرب کی مادہ پرستی (MATERIALISM) سے جب تصورِ حیات میں تبدیلی آئی تو اس کی رُو سے انسانوں کو بھی مشینیں تصور کر لیا گیا۔ اسے کہتے ہیں (MECHANICAL CONCEPT OF LIFE) ہیں۔ اس سے انسانوں کے (HUMAN BEINGS) ہونے کا تصور ختم ہو گیا اور ان کے معاملات کا حل اسی طریق سے سوچا جانے لگا جس طریق سے کسی مشین کا نقص دُور کیا جاتا ہے۔ اس طریق کی رو سے انہوں نے حکومتی نظم و نسق کے لئے بھی کچھ قواعد و ضوابط منضبط کئے۔ اور ان کے پمفلٹ متعلقہ شعبوں میں بانٹ دیئے۔ منتظمہ کے کارپردازوں کو ان قواعد و ضوابط کی تعلیم دی گئی اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ جو مسئلہ (CASE) ان کے سامنے آئے اس کے متعلق دیکھ لیا جائے کہ، اس پمفلٹ میں کیا لکھا ہے۔ اس کے مطابق اس معاملہ کا تصفیہ کر دیا جائے اور ایسا کرنے میں کسی انسانی تقاضا کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ ان انسانوں کو مشین سمجھا جائے اور اپنے آپ کو مشین کا آپریٹر۔ اس نظامِ حکومت کو بیوروکریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی "میزوں کی حکومت" (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ فائلوں کی حکومت۔ کاغذوں کی حکومت۔ اس نظامِ حکومت میں سب سے زیادہ قابل۔ دیانت دار۔ ذمہ دار۔ معتمد علیہ افسر، اسے سمجھا جاتا ہے جو متعلقہ افراد کو انسان سمجھے بغیر، ان کے معاملات کا متعلقہ قواعد و ضوابط کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اسے بھی اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر دیا، اور افسرانِ بالا بھی اس کی فرض شناسی کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ اس سے انسانیت پر کیا بیتی؟ یہ گوشہ ان کی ذمہ داری کے احاطہ ہی میں نہیں ہوتا۔ جب اس ہسپتال کے ملازمین نے، قواعد و ضوابط کی پابندی کے مطابق ہسپتال کا دروازہ نہیں کھولا تھا تو وہ پوری طرح مطمئن تھے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ

اس سے اس مریضہ کا انجام کیا ہوا؛ حتیٰ کہ اگر مرحومہ کی موت کے متعلق کوئی انکوائری بھی ہو اور یہ ثابت ہوجائے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا قاعدے اور قانون کے مطابق کیا تھا، تو انہیں اس کے لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے برعکس، اگر یہ معلوم ہوجائے کہ انہوں نے کسی قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی (خواہ وہ مریضہ کی جان بچانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو) تو انہیں چارج شیٹ دیدیا جائے گا۔ بیوروکریسی کا یہی تقاضا ہے۔

بیوروکریٹ اس نظام کو اس لئے گلے سے لگائے رکھتے ہیں کہ اس میں انہیں نہ معاملات کے فیصلہ میں چنداں کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ اس کے عواقب کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ جب وہ متنازعہ امور کا فیصلہ متعلقہ قواعد و ضوابط کی رُو سے (میکانکی طور پر) کر دیتے ہیں تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔ یہ خلش انہیں ستاتی ہی نہیں کہ اس سے "انسانیت" پر کیا گذری ہے؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آج ہمارا معاشرہ جس اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں انسانی معاملات کا فیصلہ قواعد و ضوابط کے مطابق ہندیانہ طور پر کیا جاتا ہے، وہاں انسانی تقاضوں (HUMAN-CONSIDERATION) کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا.... وہاں ترجیح "فارمز کے پُر کرنے" کو دی جاتی ہے، انسانی زندگی کو نہیں۔ اور جہاں ان ضوابط میں لچک پیدا کی جاتی ہے تو اس کا جذبہ محرکہ ذاتی مفادات (رشوت ستانی اور بدعنوانی) ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں کا کرب و اضطراب اور عدمِ سکون و اطمینان ہوتا ہے۔

—— (۰) ——

ان لوگوں کی یہ ذہنیت اور یہ اندازِ عمل، ان کی سرکاری زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا کوئی گوشہ ہو، ان کے تعلقات اور روابط یکسر مشینی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں انسانی حسیات کی رعایت یا جذبات کی لطافت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ان کے گھر کی زندگی بھی "بابوآنہ" بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے کھانے پینے کی بعض درآمدی چیزوں پر لکھا دیکھا ہوگا:۔

(UN-TOUCHED BY HAND DURING MANUFACTURE)

ان کے بنانے میں ہاتھ کو نہیں چھونے دیا گیا۔

ان حضرات کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ یہ بالکل (ROBOTS) مشینی انسان بن کر رہ جاتے ہیں۔[1]

---

[1] ان میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں جو اس جہانِ سنگ و خشت میں ذوقِ لطیف اور حسیاتِ انسانی کو برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے میں انہیں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ باہر کا آدمی کم لگا سکتا ہے۔

جب خود اپنے بال بچوں کے ساتھ ان کا رویہ اس قسم کا مشینی ہو، تو دوسرے انسانوں کے ساتھ اُن کے برتاؤ میں لوچ کیسے آسکے گی۔ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے — کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے

"نوائے دل گداز" سے یہ آشنا ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ "جہاں گیری" تو ایک طرف، جب یہ کرسی چھوڑ کر ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں معاشرہ میں ایک بھی ہمنوا نہیں ملتا۔ یہ "یوسفِ بے کارواں" کی طرح اکیلے پھرتے رہتے ہیں۔

انہیں وقت گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ قفس کے خوگر پرندے کی طرح اُٹھتے ہیں تو دفتروں کا رُخ کر لیتے ہیں لیکن وہاں کی فضا ایسی بدلی ہوئی پاتے ہیں کہ پہلے برآمدے میں ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر بابو لوگ کمرے کے اندر اپنی نشستوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر جاتے ہیں تو کوئی کرسی تک کی پیش کش نہیں کرتا۔ یونہی جھوٹی ہنسی کے ساتھ کبھی اِس کے پاس کبھی اُس کے پاس کھڑے ہو کر واپس آجاتے ہیں۔ میر تقی نے غالباً انہی کے متعلق کہا تھا کہ

تیرے کوچے ہر بہانے یوں ہی دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا!

اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز اور قابلِ رحم اُن کی ایک اور حالت ہوتی ہے۔ ریٹائر ہوتے ہیں تو "فتوحاتِ بالائی" کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور جو پنشن ملتی ہے، وہ تنخواہ کے نصف سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن پنشن اُسی دن نہیں مل جاتی اُسے منظور کرانے کے لئے دنوں مہینوں سالوں تک دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور وہاں کے مشینی انسان ان کی حالتِ زار پر کبھی ترس نہیں کھاتے۔ بعض تو انہیں چکروں کے راستے عدم آباد تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے شکایت ہی نہیں فریاد کرتے ہیں کہ پنشن سے متعلق دفاتر کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے انسان نہیں پتھر کے بُت ہیں جنہیں اس کا قطعاً خیال نہیں آتا کہ مجھ پر اور میرے بال بچوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ایسا کہتے وقت انہیں قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کل تک وہ بھی اِنہیں کرسیوں پر پتھر بن کر بیٹھے رہتے تھے۔ اور انہیں بھی کسی کے حالِ زار پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ ہر غرضمند کو یہ کہہ کر دھتکار دیتے تھے کہ میں قواعد و ضوابط کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

مذہب میں مشینی عمل

مذہب کی دنیا میں پہنچ کر رسوم پرستی اور ہی گل کھلاتی ہے۔ الدّین زندگی کے حدود متعیّن کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے فرد کو فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے لئے آپ فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ ان مقاصد کی سمت ایک قدم ہے جسے الدّین نے متعیّن کیا ہے۔

اور وہ مقصد ہے۔ ما ینفع الناس ...... (۱۳/۱۷) "جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو" اس سے اس فرد کی ذات میں بھی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے، اور اس کے معاشرہ میں بھی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مذہب میں اس کی آزادی اور خود فیصلہ لینے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ فقہ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں انسان کے ایک ایک قدم کیلئے متعین "شرعی احکام" منضبط ملیں گے۔ بیٹھو اس طرح۔ اٹھو اس طرح۔ چلو اس طرح۔ سوؤ اس طرح۔ کھاؤ اس طرح۔ پیو اس طرح۔ غسل اس طرح کرو۔ بیت الخلاء میں یوں جاؤ۔ حتیٰ کہ اس میں میاں بیوی کے جنسی اختلاط کے لئے بھی قواعد و ضوابط ہوں گے۔ ان قواعد و ضوابط کی پابندی میکانکی طور پر کی جائے گی کیونکہ ان سے مقصد، ان کی پابندی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ ان احکام کا پابند ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ عبوسًا قمطریرًا ..... قسم کی چوبِ خشک بن جائے گا جس میں انسانی زندگی کی لوچ اور لچک کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ دہلی میں ایک بہت بڑے مفتی صاحب تھے۔ ان کی بدنصیب بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ وہ ایک دن اس سے کہہ رہے تھے کہ نکاح نامہ کی رُو سے تمہارا نان و نفقہ تو میرے ذمے ہے، علاج معالجہ نہیں۔ اس کے لئے تمہیں اپنے ماں باپ سے کہنا ہوگا۔ اس قسم کی بن جاتی ہے "فطرت" ان لوگوں کی جو احکامِ شریعت کی پابندی اس طرح کرتے ہیں۔ پھر چونکہ یہ اپنے آپ کو بے حد متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان میں بے حد تکبر اور نخوت پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے خفا رہتے اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں فاسق و فاجر، جہنم کے کندے ہوتے ہیں۔ اس سے عجیب قسم کی مخلوق بن جاتے ہیں جن میں نہ زندگی کی لطافت ہوتی ہے، نہ انسانیت کی لچک۔ بیوروکریٹک کی طرح ان کی بھی اپنی الگ برادری ہوتی ہے۔ جس طرح ان کے ہاں (D.F.A) اور (P.U.C) کے سوا کوئی موضوع گفتگو نہیں ہوتا، ان کے ہاں بھی ساری زندگی "مکروہ اور مباح" کی بحثوں میں سمٹ اور سمٹا کر رہ جاتی ہے۔ اور ان کے فتووں میں انسانی زندگی کہیں بار نہیں پاتی۔ یہ انسان نہیں، قرآن کے الفاظ میں "خشب مسندہ" بن کر رہ جاتے ہیں۔

———(o)———

مذہب کی بات چھڑی تو معاملہ دُور تک جا پہنچا۔ قرآن کریم نے بھی قواعد و ضوابط اور احکام و قوانین دیئے ہیں، اور ان کی پابندی ضروری قرار دی ہے۔ ان احکام و قوانین کی رُو سے معاشرہ میں نظامِ عدل قائم ہوتا ہے، اور نظامِ عدل کو قرآن نے بڑی اہمیت دی ہے۔

نظامِ عدل

.... لیکن قرآنی نظامِ عدل اور بیوروکریسی کے نظامِ عدل میں بنیادی فرق ہے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ بیوروکریٹک نظام میں نہ مجرموں کو انسان سمجھا جاتا ہے، نہ جج کے سینے میں دھڑکنے والا دل ہوتا ہے۔ اس میں ضابطہ قوانین کی حیثیت اور کیفیت اس پمفلٹ کی سی ہوتی ہے جس میں مشین کی تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ جج اس

مشین کا اپریٹر ہوتا ہے، جو آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھی گھما دیتا ہے۔ اس میں انسانی (CONSIDERATION) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ بات دو ایک مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔ ایک کا تعلق قانونِ شریعت سے ہے، دوسری کا ملکی قانون سے۔

فتویٰ ایک شخص غصّے سے مغلوب ہو کر اپنی بیوی کو طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دیتا ہے۔ غصّہ فرو ہونے پر وہ اپنی حماقت پر نادم ہوتا ہے اور مفتی صاحب سے پوچھتا ہے کہ اس غلطی کے ازالے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ شریعتِ حقّہ کی رُو سے اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ ایک رات کی "شب باشی" کے بعد وہ اُسے طلاق دے دے اور اس کے بعد تم اس سے دوبارہ نکاح کر لو۔

یہ سُن کر پانچ چھ بچّوں کی ماں، پچاس سالہ بڑھیا پر قیامت گذر جاتی ہے۔ وہ اس قسم کی بے غیرتی کا تصوّر تک نہیں کر سکتی۔ وہ روتی ہے، بلبلاتی ہے اور مفتی صاحب سے کہتی ہے کہ غلطی اور حماقت تو اس کے خاوند نے کی اور اس کی اس قدر شرم ناک سزا اسے دی جا رہی ہے۔ کس جرم کی پاداش میں؟ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ فقہ میں ایسا ہی کہا گیا ہے۔ شریعت کا یہی حکم ہے۔ میں اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔

قطعِ نظر اس کے کہ یہ شرعی حکم بھی ان حضرات کا خود ساختہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شریعت میں اس قسم کی مظلوموں کی غیرت و حمیت کی کوئی گنجائش نہیں؟ یہ عفّت مآب، انسان نہیں مشین ہے! مفتی صاحب ان سوالات کا جواب دینے کے لئے اپنے آپ کو مکلّف نہیں پاتے۔ وہ فتوے صادر فرما دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے شریعتِ حقّہ کا تقاضا پورا کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ!

سزا کس کو ملی؟ (۲) مجسٹریٹ نے چوری کے مجرم کو چھ ماہ کی قید کا حکم سنا دیا۔ ضابطہ تعزیرات کی رُو سے یہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ مجرم، اپنے بیوی بچّوں اور بوڑھے ماں باپ کا واحد کفیل تھا۔ قانون نے اپنا تقاضا پورا کر لیا لیکن کسی نے یہ نہ دیکھا کہ چھ ماہ تک اتنے بڑے غریب خاندان کی روٹی کا کیا ہو گا! مجرم کو تو اپنے جرم کی سزا ملی، لیکن اس خاندان کو کس جرم کی پاداش میں یہ سزا ملی؟ ——— اور سزا بھی ایسی جو مجرم کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ مجرم کو جیل خانہ میں التزاماً روٹی ملتی رہے گی لیکن اس خاندان کی روٹی کی ذمہ داری کسی کے سر پہ نہیں ہو گی! قانون اور عدالت کی نگاہوں میں یہ انسان ہیں ہی نہیں! مجرم کے بچے بھوک سے مر جائیں گے تو اس سے اس مجسٹریٹ (یا واضعینِ قانون) کے دل میں نہ کوئی کھٹک پیدا ہو گی، نہ ان سے کسی قسم کی باز پُرس ہو گی!

قرآنی نظامِ عدل قرآنی نظامِ عدل میں، انسانی پہلو کو مقدّم رکھا گیا ہے۔ اس نظام کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے، اس لئے قوانینِ خداوندی میں بھی اسی پہلو کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور ان قوانین کے اطلاق میں بھی اسی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یعنی اس میں جج صاحبان

کا فریضہ یہ نہیں ہوتا کہ ان قوانین کو مشین کی طرح نافذ کر دیا جائے۔ ان کا فریضہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ قانون کی مذکورہ بالا غرض و غایت کس طرح پوری ہوتی ہے۔ یعنی قانون اس غرض و غایت کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ ہم پہلے دو ایک مثالیں اس امر کی پیش کریں گے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں انسانی پہلوؤں کی کس قدر رعایت رکھی گئی ہے، اور اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ قرآن کے تعزیراتی قوانین کے اطلاق میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ پہلے قانون سازی کا گوشہ لیجئے۔

قرآنی قوانین

(۱) ۔ تاریخِ اجراء سے پہلے

قرآن کا پہلا اصول یہ ہے کہ قانون کا اطلاق اس کی تاریخ اجراء سے ہوگا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔ اس پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی۔ اس نے جہاں بھی کسی نئے قانون کا تعین کیا ہے، ساتھ ہی کہہ دیا ہے: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ (۴/۲۳ ز ۵/۳۸ ز ۲/۲۷۵) "پہلے جو ہو چکا، ہو چکا"۔ سوچئے کہ اس سے افرادِ معاشرہ کو کس قدر اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

(۲) قانون سے عدم واقفیت

سیکولر قانون یہ ہے کہ قانون سے واقفیت، اس کی خلاف ورزی کی وجہ جواز نہیں ہو سکتی۔ مجرم قانون سے واقف ہو یا نہ، اسے بہرحال سزا مل کر رہے گی۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو خلاف ورزی قانون سے ناواقفیت کی بنا پر سرزد ہو، وہ قابلِ معافی ہے۔ افرادِ معاشرہ کو قانون سے آگاہ کرنا، حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اگر حکومت اپنی اس ذمہ داری کے پورا کرنے میں قاصر رہتی ہے تو اس کی سزا افرادِ معاشرہ کو کیوں ملے؟ (۶/۵۴ ز ۱۶/۱۱۹)۔

(۳) ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو

اگلا اصول یہ ہے کہ ارتکابِ جرم میں دل کا ارادہ شامل ہو، وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۲۲۵ ز ۲۳/۵) اس سے دیکھئے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے والے جج پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ وہ کسی مشین کی نقل و حرکت کا فیصلہ نہیں کر رہا۔ انسانوں کے عمل و اقدام کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے لئے احوال و کوائف اور نفسیاتِ انسانی کی جن گہرائیوں تک جانے کی ضرورت ہوگی، وہ ظاہر ہے۔

(۴) اضطراری حالت

قرآنِ کریم نے جہاں کھانے پینے کی چند ایک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، وہاں ساتھ ہی یہ بھی

کہہ دیا ہے کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط...... ٥ (۲/۱۷۳) یعنی اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے اور کچھ نہ ملے اور تم رجان بچانے کے لئے) مجبور ہو جاؤ، تو ایسی حالت میں ان چیزوں کو بھی کھا سکتے ہو جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ تم واقعی مجبور ہو جاؤ اور تمہاری نیت قانون شکنی اور یا ہوس پرستی کی نہ ہو۔

قرآنِ کریم نے یہ استثناء بہ نصِ صریح کھانے پینے کی چیزوں کے ضمن میں روا رکھی ہے لیکن بعض دیگر حالات میں بھی اضطراری حالت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً حفاظتِ خود اختیاری کے لئے کسی کو قتل کر دینا۔ جج صاحبان کے لئے یہ متعین کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ایسا عمل اضطراراً کیا گیا ہے۔ اس کے لئے بھی گہرے غور و تدبر اور انسانی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

واضح رہے کہ یہ اضطراری گنجائش ہر تقاضے کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً اس نے بھوک پیاس کی صورت میں تو اضطرار کو تسلیم کیا ہے،...... جنسی تقاضوں میں اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے کہا ہے کہ اگر جائز طریق سے جنسی تقاضے کی تسکین کی صورت نہ ہو، تو ضبطِ نفس سے کام لیا جائے۔ (۲۴/۳۳)۔ لہٰذا، اضطرار کوئی ایسی گنجائش نہیں کہ جہاں جی چاہے اس سے فائدہ اٹھا لیا جائے اور اس طرح ہر ناجائز کام کو جائز قرار دے دیا جائے۔ فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

(٠)

اب آئیے تعزیرات کی طرف۔ اس نے کہا ہے کہ جس شخص کے خلاف کسی جرم کے ارتکاب کا الزام عائد کیا جائے، اس کے خلاف پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ہو سکتا ہے یہ الزام جھوٹا ہو۔ یعنی پہلا ردِ عمل اسے مجرم تصور کر لینے کا نہیں، بلکہ محض ملزم تصور کرنے کا ہونا چاہیئے۔ سورۃ النور میں، جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جسے عام طور پر واقعہ اِفک کہا جاتا ہے (اور جہالت یا سازش کے تحت، حضرت عائشہ رضؓ کو اس میں ملوث قرار دیا جاتا ہے) وہاں دو بار سختی سے کہہ دیا کہ جب فتنہ پردازوں نے اس فتنہ کو ہوا دی تھی تو تمہیں بلا ساختہ کہہ دینا چاہیئے تھا کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ......٥ (۲۴/۱۲) هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ...٥ (۲۴/۱۶)۔ یہ محض تہمت تراشی ہے۔ یہ بہتان ہے۔

آپ غور کیجئے کہ اس سے ملزم اور معاشرہ پر کیسا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں کے سیکولر نظام میں، جو کچھ "ملزموں" کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی جنہیں محض شبہ کی بنا پر شاملِ تفتیش کر لیا جاتا ہے۔ اور آگے چل کر ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں) کہ اکثر اوقات وہ اس اذیت سے بچنے کے لئے یا تو جھوٹا اقبالِ جرم کر لیتے ہیں اور یا (بعض اوقات) خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

معاشرہ، انتظامیہ اور عدالت کی طرف سے اس ردِ عمل (یعنی ملزم کو بے گناہ سمجھے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملزم کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں لگتی۔ قرآنی نظام کی غایت، احترامِ آدمیت کا برقرار رکھنا ہے۔ ملزم تو ایک طرف، وہ تو مجرم کو بھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا! بلکہ اس کی لغزش پر اس سے اظہارِ ہمدردی

کرتا ہے۔ مجرموں کی تباہی پر، خود خدا بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ یٰحَسْرَةً عَلَی الْعِبَادِ... (۳۶/۳۰) "اومیرے بندو! کس قدر تاسف انگیز اور حسرت ناک ہے تمہاری یہ حالت!" وہ جرم سے نفرت کی تلقین کرتا ہے، مجرم سے نہیں۔ اور ان دونوں میں فرق کرنا عمیق بصیرت چاہتا ہے۔ قرآنی نظامِ عدل کا یہی تقاضا ہے۔ بعض جرائم ایسے شنیع ہوتے ہیں کہ ان سے مستغیث کے دل میں غصے کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ قرآن کریم مومنین کی صفات یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ ایسی حالت میں بھی عفو اور درگذری سے کام لیتے ہیں۔ (۴۲/۳۷) حضرت عمرؓ نے اسی بنا پر کہا تھا کہ کسی کے صحیح کردار کا معلوم کرنا ہو تو اسے غصے کی حالت میں پرکھنا چاہیئے۔

(٠)

معافی

اب ہمارے سامنے وہ مقام آتا ہے جہاں قرآنی نظام، دنیا کے ہر نظامِ عدل سے منفرد نظر آتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنی نظامِ عدل کی غایت افراد اور معاشرہ کی اصلاح ہے۔ وہ اسے ترجیح دیتا ہے کہ یہ مقصد بغیر سزا کے حاصل ہو جائے۔ اور سزا وہیں دیتا ہے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ اثباتِ جرم کے بعد معاف کر دینے کو عام طور پر رحم (MERCY) کہا جاتا ہے، اور چونکہ عدل اور رحم متضاد عناصر ہیں، اس لئے رحم کو نظامِ عدل کا جزو نہیں قرار دیا جاتا۔ اسے "ترحم خسروانہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں آگے چل کر اس کی وضاحت کروں گا کہ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ قرآن میں اس قسم کے رحم کا تصور نہیں۔ سرِ دست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآنی نظامِ عدل میں سزا اور معافی دونوں کو ہمکنار رکھا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵/۹۸) "اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ خدا مجرموں کا مواخذہ کرنے میں بڑا سخت گیر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی معاف کر دینے میں بھی بڑا وسیع الظرف ہے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے، دو ایک اہم نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) قرآن کریم نے خدا کی جن صفات کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ مومنین میں (علیٰ حدِ بشریت) ان صفات کا منعکس ہونا ضروری ہے۔ اور اس کی محسوس اور مرئی شکل یہ ہے کہ ان کا نظام، ان صفات کا مظہر ہو۔ یعنی اس نے جب کہا ہے کہ خدا شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام کو ان ہر دو خصائص کا حامل ہونا چاہیئے۔ یعنی مجرمین کی گرفت کرنے والا بھی اور معاف کر دینے والا بھی۔

(۲) چونکہ ہمارے مروجہ اسلام کے تصورات اور مسالک دورِ ملوکیت کے وضع کردہ ہیں؛ اس لئے اس معاشرہ میں، صفاتِ خداوندی کے انعکاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ استبدادِ ملوکیت کے حامل معاشرہ میں "خدا" کا کیا کام؟

اس سے، سوال پیدا ہوا کہ قرآن میں جو صفاتِ خداوندی کا اس قدر ذکر ہے تو اس کا مطلب اور مقصد کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان صفات کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خدا کافروں کو جہنم رسید کرے گا اور مسلمانوں کے گناہ بخش کر انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ "بخش دینے" کی اصطلاح قابلِ

مغفرت کے معنی

غور ہے کیونکہ اس کے گرد ہمارے تصورِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت گردش کرتی ہے۔ "بخشش" کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ یعنی جو چیز بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) نہ ملے۔ بطورِ خیرات ملے۔ اس سے خدا کے بخش دینے کا تصور قائم ہوا۔ یعنی اعمال کے لحاظ سے تو ہم جہنم کے مستوجب ہوں گے لیکن خدا ہمارے گناہ "بخش دے گا" اور اس طرح ہمیں جنت بطورِ خیرات مل جائے گی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است!
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش — بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است (ارمغانِ حجاز)

اور یہیں سے مغفرت کا ترجمہ "بخشش" اور غفور کا ترجمہ "بخشنے والا" کر دیا گیا۔

تاریخ کے اولیں دور سے آج تک، بادشاہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اختیارات و اقتدارِ خداوندی کا حامل سمجھا اور منوایا ہے۔ ہندوؤں کے راجے ایشور کے اوتار تھے۔ عیسائیوں کے شاہنشاہ، حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) کے علمبردار۔ مسلمانوں کے سلاطین، ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ)۔ ان اختیارات کی رُو سے، مملکت کی ہر شے، بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی اور رعایا کو جو کچھ ملتا تھا، اس کی طرف سے "بخشش" کے طور پر ملتا تھا۔ انسان کی سب سے قیمتی متاع، اس کی جان ہوتی ہے۔ سلاطین کے اس منصب کی رُو سے، افراد کی جان بھی، ان کی ملک ہوتی تھی اور افراد کے پاس ان کی طرف سے بخشیدہ۔

قرآن میں بیان کردہ داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں جب انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ میرا خدا

ترحمِ خسروانہ!

وہ ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی ہے، تو اس نے کہا تھا کہ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ...... (۲/۲۵۸) نہیں! افراد کی موت اور حیات میرے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ وہ جسے چاہتا ...... موت کی سزا دے دیتا۔ پھر مجرم اس کے حضور روتا چیختا۔ گڑگڑاتا۔ نہ صرف ہاتھ جوڑتا بلکہ سجدے بھی کرتا اور انتہائی عجز و لجاجت سے کہتا ...... کہ حضور میری جان بخشی کر دیجئے۔ اور اس کا ایک اشارۂ ابرو، اس کی "جان بخش دیتا"۔ اس سے درحقیقت تذلیلِ انسانیت مقصود تھی۔ بادشاہ اپنے مخالفین کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقوق ہر دور کے شاہنشاہوں نے اپنے لئے مخصوص رکھے۔ حتیٰ کہ آج کی مہذب دنیا میں بھی، جہاں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ملوکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تمام دنیا کے دساتیر (CONSTITUTIONS) میں سزائے موت پانے والے مجرموں کی "رحم کی درخواست" منظور یا مسترد کرنے کا اختیار سربراہِ مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہی نمرود کے تمرد کی صدائے بازگشت ہے۔ وہی روحِ ملوکیت ہے جو آئینی پردوں میں رقصاں ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس "ترحمِ خسروانہ" سے جان تو بخشیش میں مل جاتی ہے لیکن انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر قلبِ حساس کر سکتا ہے۔ ایک انسان کا اپنے جیسے انسان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا اور منتیں کرنا کہ حضور! میری جان بخشی کر دیجئے، اس سے بڑھ کر ایک طرف کبر و تمرد اور دوسری طرف تذلیلِ انسانیت اور کیا ہو گی۔ چنانچہ ہمیں تاریخ میں ایسے غیور "مجرموں" کے نام جلی حروف میں لکھے ملتے ہیں جنہوں نے جلاد کی تلوار یا پھانسی کے تختے کو قبول کر لیا لیکن اپنے ہی جیسے انسان (سربراہِ مملکت) سے جان کی بھیک مانگنا گوارا نہ کیا۔

قرآن کریم نے تذلیلِ انسانیت کی اس رسمِ کہن کا خاتمہ کر دیا اور سزا سے معافی کو، کسی حاکمِ اعلیٰ کی خیرات کی جگہ، خود قانونِ تعزیرات کا جزو بنا دیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا جس سے قرآن نے دنیائے انسانیت کو آشنا کرایا۔ آپ کو قرآن کریم میں ہر جرم کی سزا کے بعد "اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" لکھا ملے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی، شدید العقاب (سخت مؤاخذہ) اور غفور رحیم (معافی) دونوں سے مرکب ہیں۔

غفور رحیم

واضح رہے کہ مغفرت کے معنی "بخشش" نہیں۔ اس کے معنی حفاظت ہیں۔ اور غفور کے معنی 'بخشنے والا' نہیں، بلکہ حفاظت کرنے والا ہیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں کچھ نقصان ہوتا ہے، اور خود مجرم کی ذات کا زیاں بھی۔ قرآنی قانون میں اس نقصان کی تلافی کی گنجائش (PROVISION) رکھ دی گئی اور اس طرح معاشرہ اور اس فرد کو جو نقصان پہنچا تھا، اس کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا۔

رحیم کے معنی "رحم کرنے والا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں، سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے والا۔ خدا کے غفور رحیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ.... ارتکابِ جرم سے مجرم کی ذات کا جو نقصان ہوا ہے اسے اس سے محفوظ بھی رکھا جائے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما پانے میں جو کمی رہ گئی تھی (اور جس کی وجہ سے اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہوا تھا) اسے بھی دور کر دیا جائے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے معافی سے مراد، جس کی گنجائش ہر جرم کی سزا کے قانون میں موجود ہے۔ "قانون کے اندر موجود" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ معافی کسی انسان کی طرف سے، خیرات یا بھیک کے طور پر نہیں ملتی۔ مجرم اسے قانونی استحقاق (LEGAL RIGHT) کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح اس کی عزتِ نفس بھی مجروح نہیں ہوتی۔

معافی کی شرائط

لیکن یہ معافی یونہی نہیں مل جاتی۔ یہ ایک اہم شرط سے مشروط ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۵/۳۹) جو مجرم، ارتکابِ جرم کے بعد اپنے کئے پر دل سے نادم ہو اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کرے (اور مجاز اتھارٹی اس کا اطمینان کر لے کہ اس

میں اصلاح کا واقعی امکان ہے) تو اسے "مغفرت اور رحمت" کے حق سے نوازا جا سکتا ہے۔ سزا کا مستوجب وہ ہوگا جو جانتے بوجھتے جرم کا ارتکاب کرے اور اپنے جرم پر نادم ہونے کے بجائے اس پر اصرار کرے۔ چنانچہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ معافی کا حقدار وہ ہے: وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ (۳/۱۳۵) "اسے خلاف ورزئ قانون کے نقصانات کا علم و احساس ہے،... اور اس پر اصرار نہ کرے"۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن میں جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ آخری درجہ پر "عادی مجرموں" کے لئے ہیں۔ یعنی جو بار بار ارتکاب جرم کریں۔

ان تصریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ اسلامی نظام میں عدالت کی ذمہ داریاں کس قدر گراں بار ہیں۔ اُسے مشینوں کی طرح قانون کے الفاظ کی پیروی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے بہت سے نرم و نازک انسانی گوشوں کا لحاظ بھی رکھنا ہوتا ہے اور قانون کے بہت سے مستور تقاضوں کو پورا بھی کرنا۔

(۰)

اب آپ قرآنی قوانین کو دیکھئے۔ ان میں سزا اور عفو دونوں یکجا موجود ہیں۔ یعنی سزا سے معافی نہ تو کسی خارجی اتھارٹی کی طرف سے ملتی ہے اور نہ ہی وہ مجرم کو رحم کے طور پر عطا ہوتی ہے۔ یہ خود قانون کا جزو ہوتی ہے اور جو مجرم ان شرائط کو پورا کرتا ہے (یعنی تاب و اصلح کی شرائط کو) وہ ازروئے قانون اس کا حقدار ہو جاتا ہے۔ اس باب میں ہم معمولی لغزشوں سے شروع کر کے سنگین جرائم تک پہنچیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کی رُو سے کوئی بھی جرم ایسا نہیں جس میں معافی کی گنجائش نہ ہو یعنی جس میں ارتکابِ جرم کے بعد خدا کے "غفور رحیم" ہونے کا ذکر نہ ہو۔

معافی قانون کی رُو سے!

۱۔ عام اصول

سورۃ النساء میں ہے:۔

وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا ○ (۴/۱۱۰)

جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جس کا تخریبی اثر معاشرہ پر پڑتا ہو، یا خود اس کی اپنی ذات پر، اور پھر وہ اس کے لئے خدا سے حفاظت طلب کرے، تو اس نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور اس کی ذات کی نشوونما کا سامان بھی مہیا ہو جائے گا۔

اس اصول مذکرہ میں ہر قسم کا جرم آ جاتا ہے، خواہ وہ معاشرہ کے خلاف ہو یا انسان کی اپنی ذات کے خلاف۔

سورۂ نمل میں قصہ حضرت موسےٰؑ کے ضمن میں فرمایا کہ اس شخص کو ڈرنے کی ضرورت نہیں:۔

إِلَّا مَن ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (۲۷/۱۱)

جو کوئی زیادتی کر بیٹھے لیکن اس کے بعد حسن کارانہ انداز سے (قانون اور قاعدے کے مطابق)

اس کا ازالہ کرلے، تو وہ خدا کی طرف سے مغفرت اور رحمت سے نوازا جائے گا۔

سورۂ اعراف میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۷/۱۵۳)

جن لوگوں سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے لیکن اس کے بعد وہ اس سے تائب ہو جائیں اور قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین کرلیں، تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائیں گے۔

اس آیۂ جلیلہ میں، تَابُوْا کے بعد اٰمَنُوْا، بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو اس وقت درحقیقت، اس قانون کی محکمیت اور مکافاتِ عمل پر اس کا ایمان نہیں ہوتا۔ اگر اسے اس کا یقین ہو تو اس سے ارتکابِ جرم سرزد ہی نہ ہو۔ معاشرہ سے جرائم کے انسداد، یا کم از کم اصلاح کے لئے یہ بڑا مؤثر طریق ہے۔ یعنی افرادِ معاشرہ کے دل میں قانون کے احترام اور اس کی خلاف ورزی کے نقصانات پر علیٰ وجہ البصیرت یقین (ایمان) کو پختہ سے پختہ تر کیا جائے۔ اور یہ عمل مسلسل اور متواتر جاری رہے۔ یہ مقصد قانون کی پابندی کے خوشگوار نتائج کو محسوس شکل میں سامنے لانے سے حاصل ہوگا۔

سورۂ احزاب میں اس اصولِ مغفرت (معافی) کو ہمہ گیر بتایا گیا ہے، فرمایا:۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (۳۹/۵۳)

(اے رسول!) میرے ان بندوں سے، جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، کہہ دے کہ وہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمام لغزشوں کے نقصانات کی تلافی کا انتظام کر دے گا۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔

اس کا طریق یہ ہے کہ

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (۳۹/۵۴)

وہ فوراً قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کریں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، قبل اس کے کہ سزا ان پر وارد ہو جائے۔ اس صورت میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔

خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ (۳۹/۵۵)

جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے (یعنی قرآن کریم) اس کا بطریقِ احسن اتباع کرو قبل اس کے کہ تم اپنے دل میں مطمئن ہو رہو کہ مجھ سے کون مؤاخذہ کر سکتا ہے، اور خدا کا قانون

تمہاری گرفت کرلے۔

(ضمناً) آیت (۳۹/۵۳) میں "اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ..." کہا گیا ہے۔ یعنی مجرم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسرے شخص کو نقصان پہنچایا ہے، حالانکہ اس ارتکابِ جرم سے خود اس کی ذات کو نقصان پہنچا ہے۔ فریقِ مقابل کو تو کوئی طبعی نقصان پہنچا ہوگا۔ اس سے خود اس کی ذات کو نقصان پہنچا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا، یہ جرم کسی اور کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف سرزد ہوا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ... (۴/۱۱۱) "جو شخص بھی کوئی جرم کرتا ہے، تو وہ جرم کسی دوسرے کے خلاف نہیں، خود اس کے اپنے خلاف ہوتا ہے"۔ اس حقیقت کو اگر افرادِ معاشرہ کے دل میں جاگزیں کر دیا جائے، تو معاشرہ سے جرائم معدوم ہو جائیں۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے متعلق جو حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں جرائم معدوم ہو گئے تھے تو اس کی وجہ انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کی حسن کارکردگی نہیں تھی۔ اس کی وجہ، افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی ذہنیت کی تبدیلی تھی۔ قانون کی صداقت پر ان کا یقین محکم تھا۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، معاشرہ میں اصلاح ہو ہی نہیں سکتی، (۱۳/۱۱)۔ ڈنڈے کے زور سے، جرائم کا انسداد تو ہو نہیں سکتا۔ اس سے البتہ، انسان حیوانوں کی سطح پر آجاتے ہیں۔

توبہ کا مفہوم

۲۔ توبہ بلا تاخیر

سورۃ الزمر کی آیات (۳۹/۵۴، ۵۵) میں جو کہا گیا ہے کہ توبہ، سزا سے پہلے ہونی چاہیئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ارتکابِ جرم کے بعد، خود مجرم کے خلاف دل میں جذباتِ نفرت کا بیدار ہونا۔ اس سے مجرم کا منفعل ہونا اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کا عزم کر لینا، اس کا نام توبہ ہے۔ سزا کی عقوبت سے بچنے کے لئے توبہ کو آڑ بنا لینا، توبہ نہیں، توبہ کے لئے دل کی تبدیلی لازمی شرط ہے۔ اس کا احساس ارتکابِ جرم کے فوری بعد ہونا چاہیئے۔ سورۃ النساء میں ہے:۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (۴/۱۷)

توبہ اُن کی قابلِ قبول ہوگی جن سے محض نادانی (جہالت) سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور وہ اس سے بلا تاخیر تائب ہو جائیں۔ یہ ہے خدا کا وہ قانون جو علم اور حکمت پر مبنی ہے۔ ان کے برعکس:۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۴/۱۸)۔

ان کی توبہ، توبہ کہلا ہی نہیں سکتی جو ارتکابِ جرم کرتے رہیں اور جب موت سامنے آ کھڑی ہو تو کہہ دیں "یا اللہ میری توبہ"۔ نہ ہی ان کی جو حالتِ کفر ہی میں وفات پا جائیں۔ یہ الم انگیز عذاب کے مستوجب ہوں گے۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ آیت (۴/۱۵۱) میں سچی توبہ کو "تجدیدِ ایمان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جرم پر اصرار کو کفر سے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد، جرائم کی طرف آیئے:۔

(۱) فواحش کی اشاعت

بے حیائی کا ارتکاب تو ایک طرف، قرآن کریم کی رُو سے اس کی اشاعت بھی جرم ہے، ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲۴/۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) میں بے حیائی کی باتیں عام کریں انہیں اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا ملے گی اور آخرت میں بھی۔ تم نہیں جانتے کہ فواحش کی اشاعت سے بھی معاشرہ کو کس قدر نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اللہ کو اس کا علم ہے، اس لئے اس نے اسے روکنے کے لئے تاکید کی ہے کہ ایسا پھر نہ کرنا (۲۴/۱۷) اس کے بعد ہے:۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۲۴/۲۰)

جو کچھ تمہارے ہاں اس سلسلہ میں ہوا ہے، اگر اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو اس سے بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ خدا کی رافت و رحمت ہے جو تمہیں ایسے نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے۔

رقیق القلبی

اس مقام پر خدا کی صفت رافت و رحمت کا خصوصیت سے ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے جرائم کا فیصلہ کرنے والے "مشینی انسان" نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے سینے میں نرم و نازک حساس قلوب ہونے چاہئیں۔

قلبِ گداز

حضورؐ کو اس قسم کا قلبِ گداز عطا ہوا تھا جس کا خدا نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ ... ۝ (۳/۱۵۹)

(اے رسول!) یہ تیرے خدا کی موہبتِ کبریٰ ہے کہ اس نے تمہیں قلبِ گداز عطا فرمایا ہے۔ اگر تم سنگدل اور سخت مزاج ہوتے، اور انسانی کمزوریوں کی رعایت کے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ نہ ہوتا، تو تمہاری جماعت کے افراد ایک ایک کر کے تمہیں چھوڑ جاتے۔ لہٰذا

تم (قانونِ خداوندی کے مطابق) ان کی کوتاہیوں سے درگذر کرو اور ان کے لئے حفاظت کا سامان طلب کرو۔ ان کی لغزشوں کی بنا پر انہیں دھتکارو نہیں بلکہ انہیں اپنے قریب رکھو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ (اس سے ان میں عزتِ نفس اور خود اعتمادی کا احساس اور بھی بڑھ جائے گا۔

ایسے ہونے چاہئیں محافظانِ آئین اور نا قدانِ قوانین خداوندی! ان کا واسطہ انسانوں سے پڑتا ہے۔ حیوانوں یا پتھر کی چٹانوں سے نہیں! آپ نے غور فرمایا کہ ان سے مشاورت کا حکم دیکر احترامِ آدمیت کا کتنا بڑا ثبوت دیا گیا ہے۔ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ — کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اور یہ نتیجہ تھا سچی توبہ کا۔ (پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ ہیں) ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے — قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے[1]

(۲) ارتکابِ فواحش

پہلے اشاعتِ فواحش کا ذکر تھا۔ اب اس کے ارتکاب کا جرم سامنے آتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔
وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (۳/۱۳۵)

مومنین کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اگر ان سے کبھی (سہواً) فواحش کا ارتکاب ہو جائے، تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں، اور خدا سے اپنی لغزش کے نقصان کی حفاظت طلب کرتے ہیں۔ یہ سامانِ حفاظت قانونِ خداوندی کی رُو ہی سے مل سکتا ہے۔ وہ اپنی اس لغزش پر اصرار نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح خدا کی طرف سے حفاظت نہیں مل سکے گی۔

ہم نے پہلے .... کہا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے مجرم کو جو معافی ملتی ہے تو یہ رحم (MERCY) کے طور پر، خیرات نہیں ہوتی۔ اس سے تو انسانیت کی تذلیل ہو جاتی ہے۔ وہ اسے قانونی گنجائش کے طور پر بطورِ استحقاق حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں: أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ...... ۝ (۳/۱۳۶) یہ ان کے حسنِ عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ یہ ان کے عرقِ انفعال کے موتیوں کی قیمت ہوتی ہے جو انہیں ادا کی جاتی ہے۔

آپ غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم، کس طرح قدم قدم پر، اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لاتا ہے کہ

---

[1] کس قدر سچ کہا ہے کسی نے کہ ؎

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہے یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے — ہاں پانی ہو کر بہ نکلے پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

انسان اپنی کسی لغزش (جرم) کی وجہ سے احترام آدمیت سے محروم نہیں ہو جاتا۔ قرآن کریم میں "آدم وابلیس" کا تمثیلی بیان، اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ آدم سے بھی لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا، تو اس نے جھکے ہوئے سر، اور شرم آلود نگاہوں سے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۷/۲۳) "اے ہمارے رب! ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم بھول گئے۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں سامانِ مغفرت و رحمت عطا نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔" ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ ابلیس سے پوچھا تو ...... اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲/۳۴) اس نے سرکشی اختیار کی۔ اکڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے قانون کے احترام اور اطاعت سے انکار کر دیا۔ تو وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔

یہ ہے اصل الاصول قرآنی معاشرہ میں نظامِ عدل کا۔

۳۔ ایذا رسانی

سورۃ البروج میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝ (۸۵/۱۰)

جو لوگ، مومن مردوں اور عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، وہ اگر توبہ نہ کریں تو انہیں سوزناک عذاب دیا جائے گا۔

ایذا رسانی میں طبیعی ایذا اور نفسیاتی ایذا، دونوں شامل ہیں۔ یعنی تذلیل و تضحیک، جسے عرفِ عام میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی معافی (توبہ) کی گنجائش موجود ہے۔

۴۔ سرقہ

جرمِ سرقہ کی سزا کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۵/۳۸)۔

سارق مرد اور سارق عورت کے جرم کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ قطع کر دیئے جائیں۔ یہ خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے عائد کردہ روک تھام ہے۔

چونکہ زیرِ نظر موضوع کا تعلق صرف اس نکتہ سے ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے ہر جرم میں معافی کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس لئے میں "سرقہ" کی تفصیل اور قطع ید کے مفہوم کی وضاحت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، اپنے آپ کو موضوع تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ مندرجہ بالا آیت سے ملحق اگلی آیت میں ہے:۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۵/۳۹)

دیکھئے! اس میں ارتکابِ جرم (ظلم) کے بعد تائب اور اَصلَح ہونے کا کہا گیا ہے۔ سزا مل چکنے کے بعد نہیں۔ قطعِ ید کی سزا مل جانے کے بعد معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کی غفورٌ رّحیمی، تو سزا سے معافی کا نام ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، یہ سزا بھی عادی مجرموں کے لئے ہے، جو نہ اپنے جرم پر نادم ہوں۔ نہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ بلکہ.... بار بار ارتکابِ جرم کریں۔ (۵/۳۴)

۵۔ قذف (تہمت تراشی)

جرمِ قذف کی سزا اسّی کوڑے ہے (۲۴/۴) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی مذکور ہے کہ

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۲۴/۵)

(لیکن) جو لوگ ارتکابِ جرم کے بعد تائب ہوں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو وہ قانونِ خداوندی کی رُو سے معافی کے مستحق ہوں گے۔

۶۔ مستورات سے چھیڑ چھاڑ

قرآن کریم نے عفت مآب مستورات سے چھیڑ چھاڑ کو سنگین جرم قرار دیا ہے اور اس کی سخت ترین سزا مقرر کی ہے۔ ہجرتِ نبویؐ کے بعد، مدینہ کی ابتدائی زندگی میں شر انگیز عناصر کی کثرت تھی۔ مسلمان خواتین باہر نکلتیں تو وہ لوگ ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ پوچھنے پر کہہ دیتے کہ ہم نے سمجھا تھا کہ یہ بازاری عورتیں ہیں۔ ان کے اقامِ حجت کے لئے، مسلمان عورتوں سے کہا گیا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے لباس کے اوپر ایک "اوڑھنی" سا اوڑھ لیا کریں تاکہ ان میں اور بازاری عورتوں میں تمیز ہو سکے۔ اس کے بعد فرمایا:

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَہِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ لَنُغْرِیَنَّکَ بِہِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْہَآ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ مَّلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ۝ (۳۳/۶۰-۶۱)

(اگر اس کے باوجود) منافقین اور شر انگیز عناصر اور جھوٹی خبریں پھیلانے والے، اپنی خباثتوں سے باز نہ آئیں تو ان کے خلاف قوّت سے کام لینا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ (رفتہ رفتہ) یہاں سے خود ہی چلے جائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انہیں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا جائے گا۔ اگر یہ اس پر بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو جہاں کہیں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے اور شدّت کے ساتھ قتل کیا جائے۔

غور کیجئے! ایسا سنگین جرم اور اس کی ایسی شدید سزا، لیکن اس کے لئے بھی کہا گیا کہ انہیں پہلے وارننگ دی جائے۔ اگر یہ اس پر بھی باز نہ آئیں، تو پھر سزا کے اقدامات کئے جائیں۔ مقصد تو معاشرہ میں قیامِ امن ہے۔ اگر یہ مقصد سزا کے بغیر حاصل ہو جائے تو ہوا المراد۔ ایسا نہ ہو تو پھر دار و گیر کے لئے قدم اٹھایا جائے۔

۷۔ جرمِ زنا

قرآنِ کریم کی رُو سے جرمِ زنا کی سزا (عورت اور مرد دونوں کو) سو کوڑے ہے۔ (۲۴/۲) یہ چوبیسویں سورۃ ہے۔ اس سے اگلی (پچیسویں) سورۃ میں مومنین کی خصوصیات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ (۲۵/۶۸-۶۹)

یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے اقتدار کے ساتھ کسی اور کا اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ اور انسانی زندگی کو جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، تلف نہیں کرتے بجز اس کے کہ انہیں حق و انصاف کی خاطر ایسا کرنا پڑے۔ نہ ہی یہ لوگ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسا کرنا جرم ہے۔

ان جرائم کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور قیامت میں اس سے بھی زیادہ۔ یہ لوگ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہے:۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۲۵/۷۰)

لیکن جو مجرم، تائب ہو جائے۔ قانون کے احترام کا سچے دل سے یقین کرے، صلاحیت بخش کام کرے، تو خدا کا قانون اس کی سابقہ غلط روش کے نتائج کو حسنات سے بدل دے گا۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس میں جرمِ قتل اور جرمِ زنا، دونوں کو قابلِ معافی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اصولاً یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ (۲۵/۷۱)

(خدا کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنی کسی غلط روش کو چھوڑ کر صلاحیت بخش کام کرتا ہے، اس کا ہر قدم قانونِ خداوندی کی طرف اٹھتا ہے۔ (اس کی زندگی اس کے مطابق ہو جاتی ہے)۔

یعنی سابقہ غلط روش کا کوئی داغ اس کے دامنِ زندگی پر باقی نہیں رہتا۔ اس کے سب دھبے دُھل جاتے ہیں۔

۸۔ لواطت یا سحاقت

سورۃ النساء میں ہے:۔

وَالّٰتٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ ..... ۝ (۴/۱۶)

اگر دو مرد (یا دو عورتیں) بے حیائی کے جرم کی مرتکب ہوں تو انہیں مناسب سزا دو۔

اس سے عام طور پر لواطت یا سحاقت دونوں جرم مراد لئے جاتے ہیں۔

جتنا حصہ اوپر درج کیا گیا ہے وہ اس آیت کا حصۂ اوّل ہے۔ بقایا آیت یوں ہے:۔

فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝ (۴/۱۶)

لیکن اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو کر اس سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں، تو ان سے درگذر کرو۔ قانونِ خداوندی میں معافی کی گنجائش ہے جو باعثِ رحمت بن جاتی ہے۔

۹۔ قتلِ ناحق

قرآنِ کریم کی رُو سے قتلِ ناحق سنگین ترین جرم ہے۔ اگر وہ قتلِ عمد ہے تو اس کی سزا موت ہے۔ اگر قتلِ خطا ہے تو سزا دیت (خوں بہا کی ادائیگی) ہے۔ (۴/۹۲-۹۳) اوپر آیات (۲۵/۶۸-۷۰) درج کی جا چکی ہیں۔ ان کی رُو سے جرمِ قتل میں بھی معافی کی گنجائش ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر سکتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ مجرم کو معاف کر دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ جرم، قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ لہٰذا، اس کی عقوبت (سزا یا معافی) کا فیصلہ بھی قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوگا۔ معافی کی گنجائش خود قانونِ خداوندی میں رکھ دی گئی ہے۔ جیسے مجرم "تاب و اصلح" کی شرائط پوری کرنے سے حاصل کر سکتا ہے۔ کسی کے عطا کرنے سے نہیں۔ حتیٰ کہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) اس کا حق سربراہِ مملکت کو بھی حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی حق کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے جرمِ قتل کو معاف کر دیا تھا۔ (۲۸/۱۶)۔ واضح رہے کہ یہ معاملہ خدا اور اس کے ایک نبیؑ کے درمیان تھا جس کے ساتھ خدا براہِ راست ہم کلام ہو جاتا ہے لہٰذا، حضرت موسیٰؑ کے جرم کو خدا نے براہِ راست معاف کر دیا۔ ہمارا اور خدا کا معاملہ اس کی کتاب (قوانین) کے ذریعے سے ہے، اس لئے ہمارے جرائم کا فیصلہ خدا کی کتاب (قانونِ خداوندی) کی رُو سے ہوگا جس کی قوتِ نافذہ قرآنی حکومت ہوتی ہے۔

۱۰۔ بغاوت یا انارکی

سورۂ مائدہ میں ہے:۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۵/۳۳)

جو لوگ نظامِ خداوندی (قرآنی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں۔ یا ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے۔ یا مخالف سمت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں جلاوطن (یا نظربند) کر دیا جائے۔ یہ سزا ان کے لئے دنیا میں ذلت و رسوائی کا موجب ہوگی۔ اور اُخروی زندگی میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

اس کے بعد ہے :-

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵/۳۴)

لیکن جو لوگ اس سے از خود باز آجائیں (تائب ہو جائیں) قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پالو (اور اس طرح وہ مغلوب ہو جائیں) تو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے انہیں بھی معافی مل سکتی ہے۔

یہاں معافی ان کے لئے بتائی گئی ہے جو مغلوب ہونے سے پہلے ہتھیار رکھ دیں اور تائب کی شرط پوری کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں ان سے مؤاخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغلوب ہونے کے بعد وہ شرمسار اور نگوں سار ہوں اور ان میں اصلاح کا امکان نظر آئے تو پھر بھی انہیں معاف کیا جا سکتا ہے یا انہیں بالضرور سزا دی جائے گی۔ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کا فیصلہ قرآنی حکومت پر چھوڑا گیا ہے کہ (جس طرح وہ قرآن میں تجویز کردہ سزاؤں میں سے، حسبِ موقعہ کوئی سی سزا بھی دے سکتی ہے، اسی طرح) وہ اگر مناسب سمجھے تو انہیں اصلاح کا موقع بھی دیا جا سکتا ہے۔ قریشِ مکہ نے نہ صرف قرآنی حکومت کے خلاف بغاوت کی بلکہ وہ چھ سات سال تک مسلسل ان کے خلاف لڑائیاں لڑتے رہے اور انہوں نے ہتھیار اس وقت رکھے جب مکہ فتح ہو گیا۔ اب وہ سب پابجولاں حضورؐ کے سامنے تھے۔ قرآن کی رُو سے آپ کو اختیار تھا کہ ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب سمجھتے، ان پر وارد کر دیتے۔ لیکن حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ "جاؤ تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں"۔ (یہ الفاظ حضرت یوسفؑ نے اپنے مجرم بھائیوں سے کہے تھے۔ ۱۲/۹۲)۔ حضورؐ کے اس عفوِ کریمانہ کا نتیجہ وہ نکلا جس سے نہ صرف قریش، مدینہ اور حجاز کی بلکہ ساری دنیا کی تاریخ بدل گئی۔

اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ کسی جرم کی سزا تو قرآن کے خلاف نہیں دی جا سکتی لیکن عفو کی گنجائش بہرحال ہوتی ہے۔

(۰)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، قانون کا نفاذ مشینی ضوابط کے مطابق، آنکھ بند کر کے ہتھی گھما دینا نہیں۔ اس میں انسانی تقاضوں (HUMAN - CONSIDERATIONS) کو ملحوظ رکھنا مقدم ہوتا ہے۔ قانون کا مقصد فرد اور معاشرہ کی اصلاح ہے انتقام جوئی یا اذیت رسانی سے حصولِ لذت (SADISM) نہیں۔ اگر یہ مقصد، مجرم کو اصلاح کا موقعہ دینے سے حاصل ہو سکتا ہے، تو پھر سزا دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ سزا کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی جب مجرم میں تبدیلیٔ ذہنیت کا امکان نہ ہو، اور معاشرہ کو اس کی حیوانیت یا درندگی سے بچانا مقصود ہو۔ دیکھئے! خدائے غفور و رحیم نے اسے کتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴/۱۴۷)

"اگر تم حق کو مانو اور قانون کے احترام کا دل سے یقین کرو، تو خدا نے تمہیں سزا دے کر کیا لینا ہے؟ وہ مستبد اور ظالم حکمران نہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہے اور حسن عمل کا قدردان ہے۔" یہ ہے وہ ماٹو (MOTTO) جسے قرآنی مملکت کے ارباب حل وعقد اور کارپردازانِ نظم و نسق کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔

اس کے لئے بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ خود قانون کے اندر، عفو و تخفیف کی گنجائش رکھی جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآنی قوانین میں تو (ہر جرم کے ضمن میں) اس کی گنجائش موجود ہے۔ انتظامیہ کے لئے جو قواعد و ضوابط مرتب کئے جائیں، ان میں اتنی لچک اور وسعت رکھنی چاہیئے کہ فیصلہ کرنے والا، انسانی تقاضوں کی رعایت رکھ کر، ان کے مطابق فیصلہ کر سکے۔

آپ کہیں گے کہ اگر ہر جرم کے لئے معافی کی گنجائش ہو، اور ہر انتظامی ضابطہ میں لچک اور وسعت ہو، تو اس سے بدعنوانی (CORRUPTION) کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا اعتراض بجا ہے۔ موجودہ نظام اور معاشرہ میں، جہاں جرائم بھی ناقابل معافی ہیں، اور انتظامی قواعد و ضوابط بھی بے لچک، اس قدر بدعنوانی ہے، تو اگر ان میں ایسی لچک اور گنجائش رکھ دی جائے تو اس سے یقیناً بدعنوانی کے پھاٹک کھل جائیں گے۔

لیکن ایسا کہتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جن قوانین و ضوابط کا اوپر سے ذکر چلا آرہا ہے، وہ قرآنی مملکت کے قوانین و ضوابط ہیں، قرآنی نظام کے تحت ان کا نفاذ ہوگا اور ان کے نافذ کرنے والے قرآنی سیرت و کردار کے حامل ہوں گے۔

سیرت و کردار

قرآنی نظام میں، ناجائز دولت تو ایک طرف، اپنی ضرورت سے زائد جائز دولت رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ اس میں نہ جائدادیں کھڑی کی جا سکیں گی، نہ جاگیریں قائم کرنے کی گنجائش ہوگی۔ جہاں تک کارپردازانِ نظم و نسق کا تعلق ہے، ان کی کیا کیفیت ہوگی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنے دورِ خلافت میں بیت المال سے ایک مزدور کی روزانہ اُجرت کے مطابق وظیفہ لیا۔ وفات کے وقت، باچشمِ پُرنم کہا کہ معلوم نہیں میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے جتنا لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ بہتر ہو کہ اس حساب کو یہیں چکا دیا جائے۔ ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین تھا۔ اسے بیچا اور جتنی رقم بنتی تھی اسے بیت المال میں جمع کرا دیا۔

اس سیرت و کردار کے حامل ہوں گے وہ افراد جو ان قواعد و قوانین کو نافذ کریں گے!

قانون کے نفاذ میں یہ حضرات انسانی کمزوریوں اور معاشرتی مقتضیات کا کس قدر خیال رکھتے تھے، ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ابن ملتعہؓ کے ملازموں نے کسی کی اونٹنی چرا کر ذبح کر کے کھا لی۔ جرم ثابت ہو جانے پر حضرت عمرؓ نے سزا کا حکم سنا دیا لیکن ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ میں یہ معلوم کر لوں کہ انہوں نے اس جُرم کا ارتکاب کیوں کیا تھا!..... دریافت کرنے پر مجرموں نے کہا کہ ہمارا مالک ہم سے کام تو پورا لیتا ہے لیکن کھانے کو اتنا کم دیتا ہے کہ اس سے

ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے بھوک سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ آپ نے مجرموں کو رہا کر دیا ابن بلتعہؓ کو بلا کر کہا کہ اس دفعہ تو میں تمہیں صرف اتنی سزا دیتا ہوں کہ اونٹنی کے مالکوں کو اس کی قیمت ادا کر دو۔ اگر آئندہ تم نے اپنے ملازموں کو بھوکا رکھا اور وہ اس قسم کے جرم کے ارتکاب پر مجبور ہو گئے تو اس جرم کی سزا تمہیں دی جائے گی۔

دار قطنی کی یہ روایت بھی ہمارے سامنے ہے کہ سرقہ کا ایک مجرم حضورؐ نبی اکرمؐ کے سامنے لایا گیا لیکن آپ نے اسے معاف کر دیا۔ پھر دوسری مرتبہ اس نے چوری کی لیکن آپ نے اسے پھر معاف کر دیا۔ اسی طرح تیسری مرتبہ اور چوتھی مرتبہ بھی۔ جب اس نے پانچویں مرتبہ چوری کی تو پھر آپؐ نے سزا نافذ فرمائی۔۔۔۔ (کنز العمال)۔ روایت میں یہ تو نہیں بتایا گیا کہ اس بار بار معافی کی بنیاد اور وجہ کیا تھی، لیکن یہ تھا قرآن کے اس حکم کے عین مطابق کہ سزا صرف عادی مجرموں کو دی جائے۔

حضرت عمرؓ کے متعلق عام طور پر کچھ ایسا نقشہ سامنے آتا ہے کہ وہ بڑے سخت مزاج، کرخت اور درشت قسم کے انسان تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ اپنے سینے میں کس قدر گداز قلب رکھتے تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ایک دفعہ انہوں نے کسی شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا۔ آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپؓ نے اس سے پیار کیا۔ اس پر نامزد گورنر نے کہا کہ امیر المؤمنین! میرے دس بچے ہیں لیکن کوئی میرے پاس پھٹک نہیں سکتا۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور! اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے، تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آسکتا، وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا!

آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں انتظامیہ کے لئے کس قسم کے افراد کا انتخاب ہوتا تھا؟ جہاں تک ان کی گھریلو زندگی کا تعلق ہے وہ "مشینی ضوابط" کے تابع نہیں ہوتی تھی۔ انسانی لطافت اور نزاکت کا عکس ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شخص آپؓ سے اپنی بیوی کی شکایت کر رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میاں بیوی کی زندگی میں تصوراتی (IDEAL) معیار تلاش نہیں کیا کرتے۔ یہ عملی زندگی ہوتی ہے۔ اس میں دادو ستد (GIVE-AND-TAKE) کا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل وعیال میں بچوں کی طرح رہے، اور مرد صرف اس وقت بنے جب ان کی کوئی ضرورت اس کے سامنے آئے۔

"عمرؓ کا دُرّہ" تو ضربُ المثل بن چکا ہے۔ لیکن اس دُرّے کی حقیقت کیا تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ آپؓ بازار سے گذر رہے تھے کہ دیکھا، ایک شخص شارعِ عام پر ایک عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ غصہ آگیا۔ گئے اور اسے ایک بید رسید کر دیا۔ اس نے کہا۔ امیر المؤمنین! یہ میری بیوی ہے۔ فرمایا: تیری بیوی ہے تو سربازار اس سے باتیں کیوں کر رہا ہے۔ خواہ مخواہ مسلمانوں کو بدظنی اور عنیت پر مجبور کر رہا ہے!

اس نے کہا: امیر المؤمنین! ہم نو وارد ہیں۔ ابھی ابھی شہر میں داخل ہوئے ہیں۔ باہم مشورہ کر رہے ہیں

کہ ہم کہاں ٹھہریں۔ یہ بات بہرحال اسی جگہ کھڑے ہوکر کی جا سکتی تھی۔

یہ سُن کر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہی بید اس کے ہاتھ میں دیا اور کہا! اے بندۂ خدا! اپنا بدلہ لے لے۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

امیرالمؤمنین! یہ دُرّہ آپ کا ہے۔ آپ ہی اپنے ہاتھ میں رکھیئے۔

اس کے جواب میں آپؓ نے فرمایا:۔

سنو میرے بھائی! یہ دُرّہ نہ میرا ہے، نہ تمہارا۔ یہ اللہ کا دُرّہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں اٹھنا چاہیئے۔ اٹھانے والا کوئی ہو۔

اس نے کہا کہ

یہ درست ہے کہ یہ دُرّہ اللہ کا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے آپؓ ہی کو دیا ہے۔ یہ آپؓ ہی کو مبارک ہو۔

یہ تھا وہ معاشرہ جو قرآنی قوانین وضوابط کی رُو سے قائم ہوتا تھا۔ یا یوں کہیئے کہ اس قسم کے تھے وہ انسان جنہیں قرآن تخلیق کرتا تھا۔ اور جن کے ہاتھوں یہ معاشرہ ترتیب پاتا تھا۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم باتیں کرتے ہیں اسلامی نظام۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی شریعت کی، اور انہیں نافذ کرنا چاہتے ہیں موجودہ معاشرہ میں جس کی کوئی ٹُک بھی اسلامی نہیں۔ جب وہ اس میں فٹ (FIT IN) ہوتے نظر نہیں آتے تو طرح طرح کے اعتراضات اُبھرتے ہیں اور اس کا خمیازہ (بیچارے) اسلام کو بھگتنا پڑتا ہے، ہم سوچتے نہیں کہ سیکولر سٹیٹ یا تھیاکریسی میں اسلامی نظام قائم کیسے ہو سکے گا؟ اسلام تو انہیں مٹانے کے لیئے آیا تھا۔ اس نے اسلامی نظام کے قیام کی شرطِ اول "کفر بالطاغوت" بتائی تھی۔ (فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ... ۲/۲۵۶) ہم "طاغوتی" بنیادوں پر "ایمان باللہ" کی عمارت استوار کرنا چاہتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔ اسلامی قوانین، اسلامی نظام ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں۔

(۰)

آخر میں ایک اعتراض کا جواب، یا ایک نکتہ کی وضاحت۔

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جب اسلامی قوانین وضوابط، اسلامی مملکت ہی میں نافذ ہو سکتے ہیں، اور اسلامی مملکت اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں تو آپ اسلامی مملکت، اسلامی تصورات، اسلامی قوانین، وغیرہ کی تحقیق میں اپنا وقت اور توانائی کیوں ضائع کرتے ہیں اور انہیں لکھتے لکھاتے کا ہے کے لیئے ہیں؟

اعتراض کی حد تک میں ان حضرات سے متفق ہوں، لیکن اس کے باوجود، میں جو، بقول ان کے "اس سعیِ لاحاصل میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہا ہوں" تو اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں جب اپنے تاریخی سرمایہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اس میں، اسلامی نظام، اسلامی سیاست یا اسلامی ریاست کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے لکھا ہوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو کچھ لکھا ملتا ہے وہ ہمارے (مسلمانوں کے) دورِ ملوکیت کی تاریخ ہے۔ اور ملوکیت میں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے یا تو کچھ لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا، اور اگر کسی صاحب ہمت

نے اس کی جرأت کی ہوگی تو قصیا کریسی نے اس کا ایک ایک ورق ضائع کر دیا ہوگا۔ قصیا کریسی کی انتہائی کوشش یہ رہی ہے (اور ہے) کہ قرآن بے نقاب ہو کر اُمّت کے سامنے نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جو کچھ اسلامی ریاست سے متعلق تحقیق کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ اسی دورِ ملوکیت کی ریاست کا نقشہ ہے جس پر اسلام کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔

اندریں حالات، اگر کوئی شخص نیک نیتی سے بھی چاہے کہ معلوم کرے کہ صحیح اسلامی (قرآنی) ریاست اور سیاست کے اصول و مبانی اور خط و خال کیسے ہوں گے، تو اس کے لئے اسے تاریخ میں کوئی مواد نہیں ملے گا۔ بجز صدرِ اوّل کے منتشر واقعات کے۔ مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں قرآن پر اتھارٹی ہوں۔ لیکن میں نے بہرحال، اپنی عمر کا بڑا حصّہ اس پر غور و تدبر میں گذارا ہے اور اس کے ریاستی، سیاسی، معاشرتی، عمرانی، معاشی نظام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے حاصلِ مطالعہ و تدبّر کو منضبط اور محفوظ کر جاؤں تاکہ اگر آنے والے کسی دور میں، کسی نے اس راستے پر چلنے کی کوشش کی، تو اس پر میرے نقوشِ قدم دیکھ کر شاید اس کا حوصلہ بندھ جائے کہ یہ راستہ ویرانہ نہیں۔ اس پر اس سے پہلے بھی کوئی گامزن ہوا ہے۔ اس طرح میری یہ کوششِ ناتمام، اس کے لئے مفیدِ مطلب ہو جائے۔ یہ ہے میرا مقصد جس کے لئے میں نے اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ؎

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا مجھے میری محنتوں کا صلہ مل گیا۔ ویسے اس وقت بھی ملک (اور بیرونِ ملک) انفرادی طور پر ایسے اربابِ دانش و بینش موجود ہیں جو میری قرآنی فکر کو بنظرِ استحسان دیکھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح قرآنی تصوراتِ حیات کے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مذہبی پیشوائیت نے ترہیب و نفرت کی جو فضا عام کر رکھی ہے، اس کے پیشِ نظر میں اسے بھی غنیمت میں سے سمجھتا ہوں۔ میری حالت تو (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) یہ ہے کہ ؎

مرا در عصرِ بے سوز آفریدند بخاکم جانِ پُر شورے دمیدند
چو نخ در گردنِ من زندگانی تو گوئی، بر سرِ دارم کشیدند (ارمغانِ حجاز ص ۱۶۹)

اسی لئے میں ان حضرات سے کہا کرتا ہوں کہ ؎

ز مرغانِ چمن نا آشنایم ! بشاخِ آشیاں تنہا سرایم !
اگر نازک دلی، از من گراں گیر
کہ خونم می تراود از نوایم ! (پیامِ مشرق ص ۲۶)

پرویز

(۰)

تقدیر کی گرہیں — خُدا اور انسان کا تعلّق

(قرآن کا اسلوبِ بیان)

پرویز

جس دن سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی، اس دن سے لے کر آج تک، جس مسئلہ نے انسانی ذہن کو مسلسل وقفِ اضطراب رکھا ہے، وہ ہے مسئلہ تقدیر۔ قرآن کریم نے اس دشوار ترین گتھی کو ایسے انداز سے سلجھایا جس سے فلک پیما مفکر اور ہل چلانے والے دہقان دونوں کا اطمینان ہو گیا۔ میں نے قرآن کریم کی اس تعلیم کو اپنی بصیرت کے مطابق، اپنی تصنیف، کتاب التقدیر میں بڑے مربوط اور مدلّل طریق سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ للہ الحمد کہ اس سے سینکڑوں، ہزاروں، شکوک زدہ ذہنوں کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ بایں ہمہ مجھے اکثر ایسے استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں جن کے جواب میری کتاب میں موجود ہوتے ہیں، لیکن یہ حضرات یا تو خود اسے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے، اور اگر پڑھتے ہیں تو اس غور و فکر سے نہیں جو اس قسم کے مسائل کے سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان استفسارات کو سامنے رکھنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان مشکل مقامات کو سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے جو انداز اختیار کیا ہے، اسے آسان زبان میں پیش کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ اس اصولی انداز کو سمجھنے کے بعد، اس کی جزئیات کے سمجھنے میں چنداں دقت نہیں رہے گی۔

عالمِ امر اور خلق

سب سے پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے "دوائرِ کار" کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک عالمِ امر اور دوسرا عالمِ خلق۔ عالمِ امر کے متعلق یوں سمجھئے کہ اس میں اللہ تعالےٰ کے پروگرام (مشیّت) کی اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں ہوتیں۔ وہ خالصتہً مشیّتِ خداوندی پر موقوف ہوتی ہیں۔ انہیں خدا جس طرح چاہتا ہے مرتّب کرتا ہے جس سانچے میں چاہے ڈھالتا ہے۔ یہی نہیں کہ ہم اس سے پوچھ نہیں سکتے کہ ایسی اسکیم کس طرح اور کیوں بنائی گئی ہے۔ ہم اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ہمارا محدود ذہن خدا کے لامحدود علم کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔

لیکن جب ان اسکیموں کو محسوس پیکر عطا کر دیا جاتا ہے تو وہ عالمِ خلق میں آجاتی ہیں۔ اس عالم میں (جسے ہم خارجی کائنات کہہ کر پکارتے ہیں) اللہ تعالےٰ نے ہر شے کے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں جو

ایسے غیر متبدّل ہیں کہ، اور تو اور، خود اللہ تعالےٰ بھی (انہیں تبدیل یا محو کر سکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود) ان میں تغیّر و تبدّل نہیں کرتا۔ یہ کارگہِ کائنات، اس حسنِ نظم و نسق کے ساتھ چل ہی اس لئے رہا ہے کہ اس سے متعلق قوانین و ضوابط میں ردّ و بدل نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا کہ آگ کبھی حرارت پہنچاتی اور کبھی (خود بخود اپنی مرضی سے) ٹھنڈک پہنچانے لگ جاتی، تو زندگی ناممکنات میں سے ہو جاتی۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق کے اس فرق کو اللہ تعالےٰ نے ایک آیت میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کہا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ فرمایا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کی قدرتِ مطلقہ سے کچھ بھی بعید نہیں۔ وہ کرنے کو سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن اس نے اس کے لئے دو دو دائرے مقرّر کر رکھے ہیں۔ دائرۂ اوّل میں اس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وہ اس جملہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ عدم (NOTHINGNESS) سے کسی شے کو وجود میں لانا، لامحدود قدرت کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی بغیر کسی قسم کے سامان اور مسالہ کے کسی محسوس شے کو پیدا کر دینا۔ یہ کس طرح ہوتا ہے انسانی ذہن میں نہیں آ سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو خدا اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا (اور لایا) ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اپنا ایک بیٹا پیدا کر لے۔ لیکن اس نے کہا کہ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کا تعلق عالمِ امر سے تھا جس میں کوئی قاعدہ قانون کارفرما نہیں تھا۔ لیکن ایک بچے کی پیدائش کا تعلق عالمِ خلق سے ہے جس کے لئے ہمارا قانون یہ ہے کہ بچہ، عورت اور مرد کے جنسی اختلاط سے وجود میں آتا ہے۔ خدا کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی بیوی نہیں۔ سو جب بیوی نہیں تو اس کے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو جائے گا؟ یہ تو قانونِ تولید کے خلاف ہوگا، اور ایسا وہ کرتے نہیں۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ط .... (۶/۱۰۱) "وہ جملہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ لیکن اس کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب اس کی بیوی نہیں"۔

آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے عالمِ امر اور عالمِ خلق میں بنیادی فرق کیسی برجستہ مثال سے سمجھا دیا ہے۔ ہمارا تعلق عالمِ خلق سے ہے جس میں خدا کے غیر متبدّل قوانین کارفرما ہیں۔ غیر متبدّل کے معنی یہ ہیں کہ نہ وہ خود بخود تبدیل ہوتے ہیں۔ نہ ہی اللہ تعالےٰ انہیں تبدیل کرتا ہے۔ لہٰذا، عالمِ خلق کے سلسلہ میں جو بات بھی ہوگی، وہ ان غیر متبدّل قوانین کے حوالے سے ہوگی۔

عالمِ انسانیت

انہی غیر متبدّل قوانین میں ایک قانون یہ بھی ہے کہ خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ وہ (خدا) نہ اس کا اختیار و ارادہ چھینتا ہے، نہ اس کے کاموں میں دخل دیتا ہے۔ اس نے انسانوں سے کہہ دیا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ لَا .... (۴۱/۴۰)۔ عالمِ امر میں ہماری مشیّت کارفرما ہوتی ہے۔ تمہاری دنیا میں تمہاری مشیّت کارفرما ہوگی۔ تم جس طرح جی چاہے کرو۔ ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ جو کچھ تم کرو گے اس کے

نتائج البتہ ہمارے قوانین کے مطابق مرتب ہوں گے۔ اس نے اسے صحیح اور غلط راستے دکھا دیئے ہیں اور پھر اسے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جو سا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اس نے بتا دیا ہے کہ سنکھیا مہلک ہے اور شہد ممدِ حیات۔ اس کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ شہد کا استعمال کرے یا سنکھیا پھانک لے۔ سنکھیا کا مہلک ہونا، سنکھیے کی تقدیر (غیر متبدل تاثیر) ہے۔ شہد کا ممدِ حیات ہونا، شہد کی تقدیر۔ ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ آنی مقدار تک سنکھیا بھی مقوی حیات ہوتا ہے اور اس سے زیادہ مہلک۔ اور اسی طرح شہد بھی۔ ہم صرف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ ان اشیاء کی تقدیرات کہلاتی ہیں۔ یاد رکھیئے! تقدیر (غیر متبدل تاثیر یا خواص) اشیاء کائنات کی ہوتی ہے۔ انسان کی نہیں۔

ہم نے کہا ہے کہ انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے کہ وہ جو سا راستہ جی چاہے، اختیار کر لے۔ جس قسم کا وہ راستہ اختیار کرے گا اسی قسم کے نتائج برآمد ہوں گے۔ حتیٰ کہ انسان کے اس اختیار اور انتخاب میں خدا بھی دخل نہیں دیتا۔ لیکن جب ہم قرآن میں اس قسم کی آیات دیکھتے ہیں۔ (مثلاً) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲/۷) "اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی۔ اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ اور انہیں سخت عذاب دیا جائے گا۔" تو یہیں سے وہ تمام اعتراضات اور شکوک پیدا ہوتے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ان شکوک اور اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کے اندازِ بیان کو نہیں سمجھتے۔ اسے سمجھ لیا جائے تو پھر اس قسم کے شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے۔ میں، الگ الگ آیات پیش کرنے کے بجائے، قرآن مجید کے اس اندازِ بیان کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ اگر اسے غور و فکر سے سمجھ لیا جائے تو پھر کوئی ذہنی اشکال باقی نہیں رہتے۔

قرآن کا اندازِ بیان

اسے ہم اصولاً ایک مثال کی رُو سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ اٹل قانونِ خداوندی ہے کہ سنکھیا کھانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ کبھی کہتا ہے کہ جو شخص سنکھیا کھائے گا ہلاک ہو جائے گا۔ اور کبھی یہ کہ سنکھیا کھانے والے کو ہم ہلاک کر دیں گے۔ دونوں کا مطلب واضح ہے۔ وہ کبھی کہتا ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ... (اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے) اور کبھی کہتا ہے: كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳/۱۴) "جو کچھ وہ کرتے ہیں، زنگ بن کر ان کے دلوں کو لپیٹ لیتا ہے۔" اور یوں ان پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جس بات کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا تھا، وہ درحقیقت خدا کے مقرر کردہ قانون کا نتیجہ تھا۔ اس قسم کے شکوک کے ازالے کے لئے ضروری ہے کہ جب اس قسم کی کوئی آیت سامنے آئے تو ان تمام آیات کو دیکھ لیا جائے جو اس موضوع پر قرآن میں وارد ہوئی ہیں۔ ان میں اس قسم کے اعتراض کا جواب مل جائے گا۔

اندازِ بیان کے اقسام

قرآن مجید کا ایک انداز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فطری صلاحیتیں انسان کو دی ہیں، جب وہ ان کے مطابق کام کرتا ہے تو اسے خدا اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ مثلاً:-

(i) سورۂ بقرہ میں ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ... ۝ (۲/۳۱) "خدا نے آدم کو تمام اسما سکھا دیئے۔" ظاہر ہے کہ خدا کسی کو یہ اسما سکھاتا نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کے اندر ان اسمائے کے سیکھنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس صلاحیت کی رو سے انسان کو اس کا علم خود حاصل کرنا ہوگا۔

(ii) سورۂ الرحمٰن میں ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (۵۵/۳-۴) "خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔" ظاہر ہے کہ خدا کسی بچے کو بٹھا کر بولنا نہیں سکھاتا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو گویائی (بولنے) کی صلاحیت دے دی۔ اس صلاحیت کے مطابق انسانی بچے کو ہم خود بولنا سکھاتے ہیں۔ اگر کسی بچے کو بولنا نہ سکھایا جائے (اور اس کی پرورش جنگل کے جانوروں میں ہو تو) وہ انسانی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا۔ آیت کا ترجمہ ہی یوں ہونا چاہیئے کہ "خدا نے انسان میں گویائی (نطق) کی صلاحیت ودیعت کر کے رکھ دی۔" میں نے اسی وجہ سے اپنے "مفہوم القرآن" میں ترجمہ کے بجائے یہی انداز اختیار کیا ہے۔

(iii) سورۂ العلق میں ہے۔ اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (۹۶/۴) "خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سکھایا۔" ظاہر ہے کہ خدا کسی بچے کو قلم کے ساتھ لکھنا نہیں سکھاتا۔ آیت کا مفہوم واضح ہے کہ خدا نے انسان میں یہ صلاحیت بھی رکھ دی ہے کہ وہ بذریعہ تحریر اپنا مافی الضمیر بیان کر دے۔ لکھنا اسے خود سیکھنا ہوگا۔ جب خدا کہے گا کہ ہم نے نہیں بولنا اور لکھنا سکھایا تو اس سے مراد یہی ہوگی کہ ہم نے انہیں اس کی صلاحیت عطا کی ہے۔ جو شخص ان صلاحیتوں سے کام لے گا اسے بولنا لکھنا آجائیگا جو انہیں بروئے کار نہیں لائے گا وہ بولنے لکھنے سے محروم رہ جائے گا۔

(iv) سورۂ بقرہ میں ہے کہ جب (قرض لینے کے کسی معاملہ میں) کاتب کو دستاویز لکھنے کے لئے کہا جائے تو وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ... (۲/۲۸۲) "کاتب کو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ جس طرح اللہ نے اسے سکھایا ہے اسے چاہیئے کہ اس طرح اس دستاویز کو لکھ دے۔" ظاہر ہے کہ اس سے بھی مراد تحریر کی وہ صلاحیت ہے جسے خدا نے انسان میں ودیعت کر رکھا ہے۔ وہ خود کاتب کو لکھنا نہیں سکھاتا۔

(v) سورۂ مائدہ میں شکاری جانوروں کے متعلق ہے: وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ... (۵/۴) "جو کچھ تمہیں اللہ نے سکھایا ہے اس کے مطابق تم شکار کرنے والے جانوروں کو سدھاتے ہو۔" ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ شکاریوں کو یہ نہیں سکھاتا کہ وہ شکار کرنے والے جانوروں کو کس طرح سدھائیں۔ اس سے مراد بھی وہ صلاحیت ہے جسے خدا نے ان میں ودیعت

کر رکھا ہے۔

۲۔ بعض جبلتیں (INSTINCTS) حیوانوں اور انسانوں میں مشترک ہیں۔ جب انسان ان جبلتوں کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے تو اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں عورتوں کے ساتھ جنسی اختلاط کے سلسلہ میں فرمایا۔ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ...... (۲/۲۲۲) "تم ان کے پاس اس طریق سے جاؤ جس کا تمہیں خدا نے حکم دیا ہے۔" قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تو ایک طرف، اس کا کہیں اشارہ تک بھی نہیں۔ انسان اس پر بہ تقاضائے جبلّت عمل پیرا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اسے اپنے حکم سے تعبیر کرتا ہے۔

۳۔ کشتی، ایک خاص قانونِ فطرت کے مطابق (جو خدا کا مقرر کردہ ہے) خاص مقدار تک وزن لادے پانی پر تیرتی چلی جاتی ہے۔ سامان کے علاوہ مسافر بھی اس میں سفر کرتے ہیں۔ اسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے: وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ۝ (۳۶/۴۱) "اور یہ بات بھی ان کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانی ہے کہ ہم ان کے بال بچوں کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیتے ہیں۔" حالانکہ وہ سوار خود ہوتے ہیں، یا ان کے بڑے انہیں سوار کراتے ہیں۔ یہاں قانونِ فطرت کے مطابق عمل کرنے کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(ii) بادبانی کشتیوں کے بادبانوں کو اگر خاص ترکیب سے باندھ دیا جائے تو ہوا کی قوت انہیں متعینہ سمت کی طرف تیراتی ہوئی لے جاتی ہے۔ حضرت سلیمانؑ اپنے بحری بیڑے سے اسی طرح کام لیتے تھے۔ اس کے متعلق کہا کہ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ (۳۸/۳۶) "اور ہم نے ہواؤں کو (حضرت) سلیمانؑ کے لئے مسخر کر رکھا تھا۔ وہ جس طرف کا ارادہ کرتا، موافق ہوا ہمیں اس کے بیڑے کو ادھر کی سمت لے چلتیں۔" ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت حضرت سلیمانؑ ہی کے لئے نہیں تھی۔ ساری دنیا کے کشتی بان، ہواؤں سے اسی قسم کا کام لیتے ہیں۔ یہ قانونِ فطرت کی رو سے ہوتا ہے، جس پر عمل پیرا ہونے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(iii) حضرت داؤدؑ کے متعلق کہا کہ وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ ...۝ (۲۱/۸۰) "ہم نے اسے، تمہارے فائدے کے لئے زرہ بکتر بنانے کا علم بھی عطا کیا۔" ظاہر ہے کہ اس علم سے مراد، اس صنعت کی صلاحیت کا عطا کرنا ہے۔ اس کی رُو سے ہر لوہار زرہ بکتر بنا لیتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضروریات کے لئے ہر قسم کا خام سامان و مسالہ (MATERIAL) پیدا کر دیا ہے۔ انسان اس سامان سے اپنے مفیدِ مطلب مختلف چیزیں تیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ واضح رہے کہ "خَلَقَ" کے بنیادی معنی موجود اشیاء میں، خاص تناسب کے مطابق، امتزاج کر کے ایک نئی چیز تیار کرنا ہیں۔

(i) سورۂ النحل میں ہے: وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّن بُيُوتِكُمْ سَكَنًا ...۝ (۱۶/۸۰) "اللہ نے تمہارے لئے، تمہارے گھروں کو جائے سکونت بنایا ہے۔" ظاہر ہے کہ اللہ نے مختلف اشیاء پیدا کی ہیں جن

سے لوگ اپنے رہنے سہنے کے لئے مکان خود بناتے ہیں۔ لیکن خدا نے اس تعمیرِ مساکن کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ گھر، خدا نہیں بناتا۔ انسان خود بناتے ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا ..... ۵ (۱۶/۸۰) "اور خدا نے مویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لئے گھر بنائے"۔ مویشیوں کی کھالیں، خیمے بنانے کے کام آتی ہیں، خیمے لوگ خود بناتے ہیں۔ خدا نہیں بناتا۔ لیکن قرآن کا اندازِ بیان ایسا ہی ہے۔

(ز) اسی طرح سورۂ سبا میں ہے: وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً ..... ۵ (۳۴/۱۸) "اور ہم نے اہلِ سبا کے شہروں، اور شام اور فلسطین کے سرسبز و شاداب علاقوں کے درمیانی راستے میں بڑے بڑے نمایاں شہر بسا دیئے تھے"۔ ظاہر ہے کہ یہ شہر وہاں کے رہنے والوں نے بسائے تھے۔ لیکن اللہ تعالےٰ اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

(۰)

خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں

یہاں تک ہم نے دیکھا ہے کہ انسان جتنے کام قوانینِ خداوندی کے مطابق یا ان کی رُو سے کرتا ہے، قرآن کریم ان کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن سے مترشح ہوتا ہے کہ خدا وہ کام خود کرتا ہے۔ قرآن کریم کے اس اندازِ بیان کو ملحوظ رکھنے سے، بہت سے شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں اور بہت سے اعتراضات کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ اب اس موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آیئے۔ یعنی اس گوشے کی طرف کہ انسانی دنیا میں جو ذمہ داریاں خدا اپنے اوپر لیتا ہے، وہ انہیں انسانوں کے ہاتھوں پورا کراتا ہے، براہِ راست خود پورا نہیں کرتا۔ اس کی بیّن مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(ا) سورۃ الروم میں ہے۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۵ (۳۰/۴۷) "مومنین کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے"۔ آپ غور کیجئے کہ اللہ تعالےٰ نے کس تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ "مومنین کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے"۔ اس ذمہ داری کو وہ دیگر مقامات پر "خدا کا وعدہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ..... ۵ (۳۰/۶) "خدا اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا۔ اس کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے"۔

اسے ایک دفعہ پھر دیکھ لیجئے کہ خدا نے کہا ہے کہ مومنین کی مدد کرنا اس پر فرض ہے۔ اور یہ وہ وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے وعدے کو ہر حال میں پورا کرتا ہے۔

رسول اللہؐ کی ہجرت کے بعد ایسے مسلمان مکہ میں رہ گئے جو کمزور اور معذور تھے۔ قریشِ مکہ انہیں اذیتیں پہنچاتے تھے اور انہیں مکہ چھوڑنے بھی نہیں دیتے تھے۔ یہ بے کس و لاچار مسلمان خدا سے دعائیں مانگتے اور فریادیں کرتے تھے کہ وہ ان کی مدد کرے اور انہیں ان مستبدین کے ظلم و ستم سے نجات دلائے۔

آپ غور کیجئے کہ یہ مسلمان خدا سے مدد مانگتے ہیں۔ اور خدا نے ایسے معذورین کی مدد کرنا اپنے اوپر فرض

قرار دے رکھا ہے۔ خدا قادرِ مطلق ہے اس کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ ان کی مدد براہِ راست کرتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے اپنی یہ ذمہ داری کس طرح پوری کی تھی؟ اس نے مدینہ کے مسلمانوں سے کہا تھا:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝ (۴/۷۵)

اے (مدینہ کے مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے اٹھتے نہیں۔ (کیا تم سنتے نہیں کہ مکہ کے) بے کس، ناتوان، مرد، عورتیں، بچے، کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندے اس قدر ظالم اور سفاک ہیں! ہمارے لئے اپنی جناب سے کوئی محافظ و نگران، کوئی مددگار بھیج دے۔

آپ نے غور فرمایا کہ

(i) مومنین کی مدد کرنا، خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا تھا۔

(ii) مومنینِ مکہ خدا سے گڑگڑا، گڑگڑا کر مدد مانگ رہے تھے۔

(iii) اور خدا، مدینے کے مسلمانوں سے کہتا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے مظلوم کس طرح ہم سے مدد مانگ رہے ہیں۔ تم کس انتظار میں بیٹھے ہو! ان کی مدد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں؟

چنانچہ وہ اٹھے اور بدر کے میدان میں ان کا پہلا معرکہ ہوا۔ لیکن دیکھئے کہ اس کے متعلق اللہ تعالےٰ نے کیا کہا:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۝ (۸/۱۷)

ان دشمنوں کو تم قتل نہیں کر رہے تھے۔ خدا قتل کر رہا تھا۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے، اللہ چلا رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ تلواریں بھی مسلمان چلا رہے تھے اور تیر بھی وہی۔ لیکن اسے اللہ تعالےٰ اپنی طرف منسوب کر رہا تھا۔ اور اس طرح جب انہیں فتح حاصل ہوئی اور دشمنوں کو شکست، تو خدا نے کہا۔ وَأَنَّ اللّٰهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ (۸/۱۸) "یوں اللہ تمہارے دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیتا ہے"۔

آپ نے دیکھا کہ خدا اپنی ذمہ داریوں کو کس طرح انسانوں کے ہاتھوں پورا کراتا ہے، اور جو کچھ (یہ انسان) اس کے قانون کے مطابق کرتے ہیں، اسے کس طرح اپنی طرف منسوب کرتا ہے؟

(ii) اسلام کی رُو سے خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ جس میں:۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ..... ۝ (۹/۱۱۱)

اللہ مومنین کی جان اور مال، جنت کے عوض خرید لیتا ہے۔

یعنی خدا خریدنے والا اور مومن بیچنے والے۔ بیع و شریٰ کا معاملہ عملاً کس طرح طے پاتا ہے، وہ غور طلب ہے۔ جہاں تک مال کا تعلق ہے، خدا نے نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ..... (۹/۱۰۳) "ان کے عطیات وصول کر لیا کرو"۔ یعنی خدا، اس مال کو خود وصول نہیں کرتا۔ رسولؐ سے کہتا ہے کہ وہ اسے وصول کرے۔ جہاں تک جانوں کا تعلق ہے صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں ایسا وقت آیا جب اس معاہدۂ بیع و شریٰ کی توثیق کرانی ضروری ہو گئی۔ یا یوں کہئے کہ اس پر عمل کا وقت آ گیا۔ عربوں کے قاعدے کے مطابق افرادِ مؤمنین آتے تھے۔ حضورؐ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے تھے۔ حضورؐ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس معاہدہ کی توثیق فرماتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق کہا:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ (۴۸/۱۰)

اے رسولؐ! یہ لوگ جو تم سے بیع (جانوں کے بیچنے) کا معاہدہ کر رہے ہیں، یہ درحقیقت خدا سے معاہدہ کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ پر (تمہارا ہاتھ نہیں) خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

(iii) خدا چاہتا یہ ہے کہ دنیا میں فساد نہ رہے۔ یعنی سرکش اور مستبد قوتیں، کمزور انسانوں پر ظلم نہ کریں۔ لیکن وہ اپنے پروگرام کی تکمیل کس طرح کرتا ہے۔ فرمایا:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۱)

اگر اللہ بعض انسانوں کے ہاتھوں، دوسرے انسانوں کی روک تھام نہ کرائے، تو زمین میں فساد برپا ہو جائے۔ لیکن اللہ تو کائنات (کے رہنے والوں) پر اپنا فضل و کرم چاہتا ہے۔

خدا کا پروگرام یہ ہے کہ دنیا میں ظلم اور فساد نہ رہے۔ اس کے لئے انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی دراز دستیوں کو روکتا ہے۔ اور اس طرح فساد کی لہر رُک جاتی ہے۔ اور اللہ اسے اہلِ عالم پر اپنا فضلِ عظیم قرار دیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۲۲/۴۰)

اگر خدا انسانوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں، دوسرے انسانوں کی مدافعت نہ کرائے تو دنیا میں کسی اہلِ مذہب کی پرستش گاہ سلامت نہ رہے۔ یہودیوں کے ہیکل۔ عیسائیوں کے گرجے درویشوں کی خانقاہیں اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اکثر ہوتا ہے۔ سب منہدم ہو جائیں۔ خدا یقیناً ان کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔

ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ انسانوں کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں اپنے اوپر

لے رکھی ہیں وہ انہیں انسانوں کے ہاتھوں پوری کراتا ہے۔ لیکن اسے منسوب اپنی طرف کرتا ہے۔ لیکن کراتا ان انسانوں کے ہاتھوں سے ہے جو اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سربکف میدانِ عمل میں نکل آتے ہیں!

———— (۵) ————

خدا کا رازق ہونا

ان حقائق کی روشنی میں، اب اس گوشے کی طرف آیئے جو سب سے زیادہ غور و فکر کا محتاج، اور اسی نسبت سے، شکوک و شبہات کی آماجگاہ اور اعتراضات کا مرکز بنتا ہے۔ یعنی خدا کے رازق ہونے کا گوشہ۔ اس باب میں سب سے پہلے اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو ان کی پرورش کے اسباب اور ذرائع بھی ———— ساتھ ہی پیدا کر دیئے۔ فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ .... (۳۰/۴۰) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور (ساماِن) رزق بھی مہیا کر دیا۔" اس حقیقت کی روشنی میں یہ اصول واضح ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے آپ کو رازق کہتا ہے تو اس سے مراد ذرائع رزق کا پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔

(ii) ان ذرائع رزق میں، زمین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے؛ اور اس کے ساتھ "سماء" کو بھی، یعنی زمین، بارش، ہوا، حرارت، روشنی وغیرہ سے انسانوں (اور دیگر جانداروں) کو رزق میسر آتا ہے۔ ان ذرائعِ رزق کی تفصیل، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آئی ہے۔ لیکن سمٹے ہوئے الفاظ میں فرمایا: یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ .... (۳/۳۵) "وہ تمہیں ارض اور سماء سے رزق دیتا ہے۔"

(iii) انہی اسبابِ رزق کے متعلق کہا کہ اگر اللہ ان کی اس صلاحیت کو سلب کر لے، تو وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکے۔ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ .... (۲۱/۶۷) نیز (۶۴/۲۷؛ ۲۵/۸۰)۔

(iv) لیکن یہ رزق بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتا۔ اسے تلاش اور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ (اس طلب، تجسّس اور اکتساب کے لئے قرآن کریم کی جامع اصطلاح ابتغاء ہے) اسی ابتغاء کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا: فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ .... (۱۷/۲۹) "خدا کے ہاں سے ابتغاءِ رزق کیا کرو۔ یعنی جو ذرائع رزق اس نے بنیادی طور پر مہیا کئے ہیں، ان سے، کوشش اور محنت سے رزق حاصل کیا کرو۔ جماعتِ مومنین کو خاص طور پر تاکید کی کہ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ .... (۱۰/۶۲) "جب تم فریضۂ صلوٰۃ کی ادائیگی سے فارغ ہو جاؤ، تو ملک میں چلو پھرو اور ابتغاءِ رزق کرو۔"

حصولِ رزق کے لئے کوشش اور کاوش کرنے والوں میں "مومن اور کافر" کی بھی تفریق اور تمیز نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس فرق کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ

مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ط وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) "جہاں تک سعی و کاوش سے رزق حاصل کرنے کا تعلق ہے، ہم کافر اور مومن میں بھی تمیز نہیں کرتے۔ ہر ایک کو اس کی کوشش کا نتیجہ یکساں ملتا ہے۔ ہم نے اپنے عطیات کے راستے میں بند نہیں لگا رکھے کہ ایک کو آگے بڑھنے دیں اور دوسرے کو روک دیں۔" دوسری طرف کہا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ..... "جو کوئی بھی ہمارے ان قوانینِ فطرت سے اعراض برتے گا۔ یعنی ابتغاءِ رزق نہیں کریگا۔ اس کی روزی تنگ ہو جائے گی" ——— اور جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی ——— وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)

(۲) اب آیئے ان مقامات کی طرف جن میں خدا نے عطاءِ رزق کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم آیت (۱۱/۶) کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶) "زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔" (نیز ۲۹/۶۰) انسانوں کے متعلق بالخصوص کہا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔" (نیز ۱۷/۳۱) ان آیات سے اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ خدا نے ہر متنفس کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری براہِ راست اپنے اوپر لے رکھی ہے، تو ایسا سمجھنا بالبداہت غلط ہوگا۔ واقعات اس کی علانیہ تردید کرتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ دنیا کی کم و بیش آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے اور ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان (مرد، عورتیں، بچے) بھوک سے مر جاتے ہیں۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر خدا نے ہر ذی حیات کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری لے رکھی ہے، تو کیا اس ذمہ داری کے پورا کرنے کا یہی انداز ہے؟

قرآن خود اس تصور اور مفہوم کی تردید کرتا ہے۔ سورۂ یٰسین میں ہے: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶/۴۷) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق تمہیں اللہ نے دے رکھا ہے اسے (دوسرے ضرورت مندوں کے لئے) کھلا رکھو یعنی انہیں دیدو۔ تو کفار، مومنوں سے کہتے ہیں کہ اگر خدا ایسا ہی چاہتا ہے تو وہ ان ضرورت مندوں کو خود ہی رزق کیوں نہیں بہم پہنچا دیتا۔ ہم سے ایسا کرنے کے لئے کیوں کہتا ہے؟ (فرمایا) کہ ان سے کہو کہ ایسا کہنا (کہ خدا خود رزق کیوں نہیں بہم پہنچا دیتا) کھلی ہوئی گمراہی ہے۔"

اس میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ سمجھنا کہ جب حاجتمندوں کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری خدا کی ہے تو وہ اپنی اس ذمہ داری کو خود پورا کرے، کفر ہے اور کھلی ہوئی گمراہی۔

اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا کی یہ ذمہ داری پوری کس طرح ہوگی؟ اس کا جواب آیت زیرِ نظر کے پہلے الفاظ میں دے دیا جہاں کہا کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ..... "یعنی خدا اپنی اس ذمہ داری کو انسانوں کے ہاتھوں پوری کراتا ہے جس کے لئے وہ ان سے کہتا

ہے کہ وہ دوسرے حاجتمندوں کے لئے رزق کو کھلا رکھیں۔ یہ ہے اسلام کے معاشی نظام کی لِم اور غایت۔ یعنی ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں خدا کی یہ ذمہ داری پوری ہوتی چلی جائے۔ سارا قرآن اسی نظام کی تفصیل سے بھرا پڑا ہے۔ وہ آغازِ کلام ہی میں مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) "جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے وہ اسے ضرورت مندوں کے لئے کھلا رکھتے ہیں"۔

"رَزَقْنٰهُمْ" کی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔ اس سے مراد رزق کے بنیادی اسباب و ذرائع کا پیدا کرنا ہے۔ جب ان ذرائع سے ابتغاءِ رزق کیا جاتا ہے تو وہ اسے لوگوں کی کمائی یا ان کا مال کہہ کر پکارتا ہے: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ... (۲/۲۶۲) "مومن وہ ہیں جو اپنا مال و دولت خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا رکھتے ہیں"۔ (ضمناً) "فی سبیل اللہ" قرآن کی خاص اصطلاح ہے جس کے معنی، کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کے بغیر، اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کچھ کرتا ہے۔

اس "اَمْوَالِهِمْ" میں، زمین کی پیداوار بھی آجاتی ہے اور کسب و ہنر کی رُو سے کمائی بھی۔ فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ... (۲/۲۶۷) "اے جماعتِ مومنین! تم اپنی کمائی میں سے بھی اور جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے، اس میں سے بھی نہایت خوشگوار طریق، سے دوسروں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو"۔

احکامِ طلاق کے ضمن میں کہا کہ اگر حالات علیحدگی کے متقاضی ہوں تو اس بات سے نہیں ڈرنا چاہیئے کہ اس صورت میں کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا! فرمایا: وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ... (۴/۱۳۰) "اگر وہ الگ ہو جائیں گے تو اللہ اپنے وسیع ذرائع سے انہیں اس فکر سے آزاد اور مستغنی کر دے گا"۔

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنی اس ذمہ داری کو کیسے پورا کرتا ہے! اس نے الگ ہو جانے والے مرد سے کہا کہ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲/۲۴۱) "مطلقہ عورتوں کے لئے تاعدے اور قانون کے مطابق سامانِ زندگی کا انتظام کرو۔ ایسا کرنا متقین کا فریضہ ہے"۔ یعنی جس ذمہ داری کو خدا نے اپنے اوپر لیا تھا، متقین سے کہا کہ اس کا پورا کرنا تمہارا فریضہ ہے۔ (نیز ۶۵/۷) سورۂ بقرہ میں مطلقہ بیوی اور نوزائیدہ بچے، دونوں کا ذکر ہے۔ (۲/۲۳۳)۔

یہاں تک انفرادی ذمہ داریوں کا ذکر تھا۔ جب قرآنی نظام وجود میں آئے گا تو یہ ذمہ داریاں اجتماعی طور پر پوری کی جائیں گی۔ اس کے لئے ان لوگوں سے، جن کے پاس ان کی ضروریات سے زائد تھا، کہا کہ تم "خدا کو قرض دو" تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کر سکے۔ فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ ... (۵۷/۱۱) "جو کوئی اللہ کو قرضِ حسنہ دے گا تو اللہ اُسے دُگنا کر کے لوٹا دے گا"۔ قرآن مجید میں "اللہ کو قرض دینے کی" بکثرت آیات ہیں۔ اسی "قرضہ" کے متعلق دیگر مقامات میں کہا کہ جن لوگوں کے پاس ان کی ضروریات سے زائد مال و دولت ہے، اُس مال و دولت میں ممتاجوں اور

مفلسوں کا حق ہے؛ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (۷۰/۲۴-۲۵؛ ۵۱/۱۹؛ ۵۹/۸-۹؛ ۹۰/۱۳-۱۴؛ ۱۰۷/۱-۷)۔ ان تمام مقامات میں دیکھئے محتاجوں اور ضرورتمندوں کی ضروریات کا پورا کرنا ان لوگوں کا فریضہ بتایا گیا ہے جن کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ ہے۔ یوں یہ لوگ اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں جسے خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ یہ احکام اس نظام کے عبوری دور سے متعلق ہیں۔ اس کے آخری دور میں صورت یہ ہوگی کہ زائد از ضرورت کسی کے پاس کچھ رہے گا ہی نہیں۔ وہ سب کا سب، قرآنی نظام کی تحویل میں آجائے گا تاکہ وہ اس سے خدا کی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ۔۔۔ (۲/۲۱۹) "اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ فرمایا کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ سب"!

خدا نے کہا تھا کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔۔۔ (۱۱/۶)

زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

اور خدا کی یہ ذمہ داری ان انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہوگی جو اعلان کریں گے کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

(حضرت عمر فاروق رضؓ کا اعلان)

ذمہ داری خدا نے لی تھی اور اگر یہ پوری نہ ہوئی تو اس کا مؤاخذہ عمرؓ سے کیا جائے گا۔ یہ ہے خدا اور اس کے بندوں کا باہمی تعلق!

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز (اقبالؒ)

---(۰)---

جو کچھ ہم نے اصولاً اور مختصراً بیان کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان نکات کو یہاں دہرا دیا جائے۔ قرآنِ کریم کا اسلوبِ بیان یہ ہے کہ

(۱) انسان کا ہر کام، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اس جہت سے خدا اس کام کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو صلاحیتیں عطا کی ہیں، جب وہ ان کے مطابق کام کرتا ہے، تو خدا اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

(۳) انسان جو کام جبلی تقاضوں کے مطابق سرانجام دیتا ہے، اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

(۴) انسان جو کام قوانینِ فطرت کے مطابق کرتا ہے، انہیں بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور

(۵) انسان، خدا کے پیدا کردہ خام مسالہ سے جو نئی نئی چیزیں تیار کرتا ہے، انہیں بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

۲۔ دوسری طرف، انسانوں کے سلسلہ میں خدا نے جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ انہیں

انسانوں کے ہاتھوں پوری کراتا ہے اور منسوب اپنی طرف کرتا ہے۔ مثلاً

(i) کمزور اور مظلوم انسانوں کی مدد کرنا۔

(ii) فساد مٹانا۔

(iii) مذہبی آزادی کا قائم رکھنا۔

(iv) اس طرح تقسیمِ رزق کرنا کہ دنیا میں کوئی محتاج اور بھوکا نہ رہے۔

ہے۔ ان ذمہ داریوں کو انسانوں کی وہ جماعت پورا کرتی ہے جو اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرتی ہے۔ (اسی کو اسلامی حکومت کہتے ہیں) وہ جماعت اسے خود اپنی ذمہ داری قرار دے لیتی ہے۔ اس نظام کو اسلام کے صدرِ اوّل (عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہ کبارؓ) میں قائم کیا گیا تھا جس میں خدا کی ذمہ داریاں بطریقِ احسن پوری ہوتی چلی جاتی تھیں۔ یہی تھی وہ عظیم حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ایسے بلیغ اور لطیف انداز میں بیان کیا تھا کہ جوں جوں نگاہِ بصیرت اس کی گہرائی میں اترتی ہے، وجد آجاتا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ

> لوگو! یاد رکھو۔ میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں۔ لیکن میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔ لہٰذا، تم اپنی شکایتیں مجھ تک پہنچاؤ۔ اگر کوئی شخص براہِ راست مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ اپنی شکایت ان لوگوں تک پہنچا دے جو مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم ہر پکارنے والے کا حق، بغیر کسی پریشانی کے اس تک پہنچا دیں گے۔
>
> (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۲۸۲)

آپ ان الفاظ پر غور کیجیے کہ

> اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔

اور سوچیے کہ ان میں ایسے عمیق حقائق کو کس خوبصورتی سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان خدا سے اس وقت کچھ مانگتا (دعا کرتا) ہے جب اس کی کوئی ضرورت رُک جائے۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ کی کوئی جائز ضرورت رُکی نہ رہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ فلاں کی کوئی ضرورت رُک گئی ہے تو وہ فوراً اس کے پورا کرنے کا انتظام کر دے۔ اور اس طرح اس کی دعا کو وہیں روک لے، خدا تک پہنچنے نہ دے۔

اس میں دوسرا نکتہ یہ پوشیدہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے فریاد کرنی پڑے تو یہ گویا، سربراہِ مملکت کے خلاف خدا سے شکایت ہو گی کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہ گیا ہے۔ یہ مقصد تھا حضرت عمرؓ کے اس اعلان کا کہ میں ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دوں گا کہ تم میں سے کسی کو میرے خلاف خدا سے شکایت کرنے کی ضرورت پڑے۔

جب یہ نظام قائم تھا تو بھوک، احتیاج، محرومی، مفلسی، ناانصافی وغیرہ کا وجود ہی نہیں رہا تھا، اس لئے جبر و قدر، دعا، تقدیر جیسے مسائل بھی پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سب اس زمانے میں پیدا ہوئے جب وہ نظام باقی نہ رہا۔ ان کا حل، اس نظام کا قیام تھا۔ یہ تو مسلمانوں نے کیا نہ، اور ان "مسائل" کا حل علم الکلام (منطق اور فلسفہ) کی رُو سے دریافت کرنے لگ گئے، جس سے صورت یہ ہو گئی کہ جس قدر ان کے حل کی کوششیں کی گئیں، یہ اتنے ہی اور پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔ اس سے آگے بڑھے تو انہیں قرآن کی آیات میں بھی تضاد نظر آنے لگا۔ وہ اس کے اندازِ بیان کو سمجھ ہی نہ سکے۔

یہ "مسائل" نہیں زندگی کے حقائق ہیں۔ اور ان کا حل نظری بحثیں نہیں، اس نظام کا قیام ہے جو ان تمام مسائل کو عملاً حل کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ، تقدیر کی گتھیاں سلجھانے میں وقت اور توانائی ضائع کرنے والے، اور اپنی مظلومیت کا رونا رونے والے مسلمان سے کہتا ہے کہ ؎

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے!
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

"خود تقدیرِ یزداں" بننے کے معنی ہیں اس نظام خداوندی کا قیام جس میں خدا کی ذمہ داریاں پوری ہوتی جاتی ہیں۔ اگر وہ نظام قائم ہو جائے تو تقدیر اور دعا کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور قرآن کے اندازِ بیان کی ندرت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ورنہ یہ سب معمہ رہتے ہیں اور "علم الکلام کے مسائل" بن جاتے ہیں، جیسا ہمارے ہاں ہزار سال سے ہو رہا ہے۔ تفسیروں پر تفسیریں لکھی جاتی ہیں اور یہ مسائل ہیں کہ بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی جگہ گھومتے رہتے ہیں۔ قرآن کے مسائل منطق کی رُو سے سمجھ میں نہیں آتے۔ کر کے دکھانے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ یہی ارشادِ خداوندی ہے، یہی طریقِ نبویؐ ہے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ (۶/۱۳۵)

ان سے کہو کہ اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو، مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج سے بات واضح ہو جائے گی کہ خدا اپنی ذمہ داریوں کو کس طرح پورا کیا کرتا ہے۔

اسلامی نظام، خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی اس نظام کے اسلامی ہونے کا معیار ہے اور اس کے نتائج (کہ کسی کی ضرورت رُو کی نہ رہے) اس کے سچا ہونے کا ثبوت۔ اسلامی قوانین، اسلامی نظام کا بدل نہیں ہوتے۔ قوانین کا مقصد جرائم کی روک تھام ہوتا ہے۔ اگر کسی معاشرہ کے تمام افراد قانون کے پابند ہو جائیں اور اس میں کوئی مجرم نہ رہے، تو اس سے وہ معاشرہ یا نظام اسلامی نہیں بن جائے گا۔ اسلامی نظام کی سب سے پہلی نشانی یہ ہوگی کہ اس میں رات کو کوئی بھوکا نہ سوئے اور کسی کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگے۔ اسی لئے خدا، اسلامی نظام میں بسنے والوں کو اپنا "مہمان" کہہ کر پکارتا ہے۔ مہمان کو کھانا بھی ملتا ہے اور عزت و تکریم بھی۔

سلیم کے نام ایک خط

(نوشتہ ستمبر ۱۹۵۶ء)

علماء کون ہیں؟

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ علم، وجۂ شرفِ انسانیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ علم کہتے کسے ہیں اور علماء کون ہیں؟ قرآنِ کریم نے اس سوال کا جواب بڑا جامع اور مفصل دیا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔ انہیں غور سے سننا۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے اس سے تم واقف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک انسانیت کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آچکی ہے اس میں علم و حکمت کی داستان کا آغاز ہی درس گاہِ یونان سے ہوتا ہے۔ ان میں سقراط (SOCRATES) کو ابوالآباء اور افلاطون (PLATO) کو اس کے بہترین شارح، اور بجائے خویش ایک الگ مکتبِ فکر کے موسّس کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سقراط صرف انسان کو قابلِ مطالعہ سمجھتا ہے، کائنات کو نہیں۔ اور افلاطون عالمِ محسوس کے وجود ہی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس (CONCRETE) دکھائی دیتی ہے اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ مثال (WORLD OF IDEAS) میں ہے اور یہ مرئی (VISIBLE) کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے۔ لہٰذا اس کائنات کے متعلق جو علم حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں۔ یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں، اور کان بند کر کے عالمِ تصوّر میں حاصل کیا جائے۔

افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوّف کی عمارت استوار ہوئی۔ اسی نے ہندوستان میں پہنچ کر

تصوّف

ویدانت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رُو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ یہ برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے۔ یہ ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی ناٹک کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ نہ بادشاہ، بادشاہ ہوتا ہے۔ نہ غلام، غلام۔ نہ دریا، دریا ہوتا ہے۔ نہ پہاڑ، پہاڑ۔ یہ سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہندو فلسفہ میں خدا کو نٹ راجن کہا جاتا ہے۔ یعنی نٹوں (ایکٹروں، کھلاڑیوں) کا بادشاہ! اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لو کہ کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی اسلوب (NEGATIVE ATTITUDE) پیدا ہو۔ یہی

منفیانہ اندازِ نگاہ تھا جس نے "خدا پرست" انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابلِ نفرت بنا دیا۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوّف کے راستے مسلمانوں میں بھی آگیا۔ اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر (اور مسموم) کر گیا۔ ہمارے تصوّف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوّف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی سقراط کی ہمنوائی میں کہا جاتا ہے کہ ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا بہ چمن درا (بیدلؔ)

اور کبھی افلاطون کے تتبع میں یہ کہ ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا "قابلِ نفرت" سمجھی جانے لگی (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں)۔

قرآن کا چیلنج

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں۔ یہ محض فریبِ تخیّل ہے، سراب ہے، سایہ ہے، وہم ہے، گمان ہے۔ اور جب کائنات وہم و فریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی درحقیقت علم نہیں، ظن و گمان ہے۔ قرآن آیا اور اس نے (سحرِ باطل تصوّر کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے تصوّف اور ویدانت کے نظر فریب تخیّلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ ...... یہ ان لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ (۳۸/۲۷) اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں (دنیا کو باطل اور قابلِ نفرت ٹھہرائیں) تو ان کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انکی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے ایک آیت میں صدیوں کے غلط تصوّر کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے؟ پھر اس پر بھی غور کرو کہ قرآن نے کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصوّر رکھنے والوں کو "کافر" کہہ کر پکارا ہے۔ تم نے سوچا کہ قرآن کی رُو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں، اور کافر و مومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی مزرعِ ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے، تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؟ کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ کا مظہر مسلکِ خانقاہیت ہے۔ اسی کو ویدانت اور تصوّف کہتے ہیں۔ تم اس مسلک کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس راستہ میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائیں

اور صرف طلب ریاضتیں کی ہیں۔ ان کا نتیجہ اس کے سوا کیا نکلا کہ انسانی شجرِ حیات کی ہری بھری شاخیں جھلس کر رہ گئیں۔

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اس کے بعد مثبت انداز میں کہا کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط ..... حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ کائنات حقیقت پر مبنی (REAL) ہے۔ فریبِ تخیل نہیں۔ یہ یکسر تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، تخریبی نتائج کے لئے نہیں ..... اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۹/۴۴) اس انکشافِ حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے، علم و آگہی کی بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھو سلیم! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا تھا۔ زیرِ نظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا۔ دیکھا تم نے کہ قرآن کس طرح اپنے مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

کائنات کو ایشور کی لیلا قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ (۲۱/۱۶) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیقِ کائنات ایک نہایت اہم (SERIOUS) پروگرام کا جزو ہے۔ کھیل تماشہ نہیں۔ اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے اس دعوے کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و برہان کی رو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے؟ قرآن اپنے ہر دعوے کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا اور فکر و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰/۵) ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ سنو کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط ..... یاد رکھو! جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔

آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں۔ لیکن اس کے بعد چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) پیش کر دی ہے جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷/۳۶) "یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فؤاد۔ ہر ایک پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔" تم نے سمجھا کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن، سمع (سننے) اور بصر (دیکھنے) کو انسانی حواس (SENSES) کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ اور فؤاد وہ چیز ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (MIND) کہا جاتا ہے۔ انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات (DATA) فراہم کرتے ہیں انسانی

فؤاد (MIND) تک پہنچاتی ہیں اور فؤاد ان سے استنباطِ نتائج کرتا ہے۔ تم کارتوس کی آواز سنتے ہو تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہو کہ کسی نے بندوق چلائی ہے۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنتے ہو تو سمجھ لیتے ہو کہ کسی کے گولی لگ گئی ہے اور باہر جا کر دیکھتے ہو کہ جسے گولی لگی ہے وہ تمہارا دوست ہے تو گولی چلانے والے کے خلاف تمہارے دل میں آتشِ انتقام بھڑک اٹھتی ہے۔ اس تمام واقعہ میں تمہارے سمع و بصر و فؤاد کی شہادت موجود ہے۔ لہٰذا یہ علم ہے۔ لیکن اگر تم نہ بندوق کی آواز سنو، نہ کسی کی چیخ کی۔ نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھو۔ نہ کسی گولی چلانے والے کو اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جاؤ تو تمہارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس میں تمہارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں۔ تم نے غور کیا کہ قرآن علم کے بارے میں حواس (SENSE PERCEPTION) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی نہیں۔ لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فؤاد بھی۔

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

سمع و بصر و قلب کی اس اہمیت کے پیشِ نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے، وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ..... جن و انس (شہری اور صحرائی آبادیوں) میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا..... ان کی روش یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا..... وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا..... وہ کان رکھتے ہیں، لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ..... یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹) یہ علم و حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ علم، وہی علم ہے جس کی شہادت سمع و بصر و قلب دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث یا غیر محسوس تجریدی مسائل کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے امور میں سمع و بصر کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ سمع و بصر کا تعلق مظاہرِ فطرت کے مشاہدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا۔ اس عظیم الشان اور محیر العقول مشینری کے ایک ایک پرزے کا مشاہدہ کرنا۔ پھر مختلف تجربات کی رُو سے یہ دیکھنا کہ ان پرزوں کی ساخت و پرداخت میں کونسا قانون اور ان کی نقل و حرکت میں کونسی سکیم کارفرما ہے۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں علمِ سائنس (SCIENTIFIC KNOWLEDGE) کہتے ہیں۔

اور اسی کو قرآن مومنین کا شعار بناتا ہے۔ غور کرو سلیم! کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ۔۔۔۔ (۳/۱۸۹) یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ کون ارباز دانش کے لئے؛ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ۔ ان کے لئے جو اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ۔۔۔۔ یعنی تخلیق ارض و سما میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت

خدا کا ذکر کرنے والے

اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ۔۔۔۔ (۳/۱۹۰) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔ غور کیا تم نے کہ یہ کتنی بڑی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ کائنات کی کوئی شے نہ عبث و بےکار ہے، اور نہ محض تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہے۔ لیکن قرآن کریم کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس کے دعوے کو یونہی مانتے رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ ہے کہ تم کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہدات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق یہ ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ۔۔۔۔ سوچو سلیم! یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جسے قرآن نے جماعتِ مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جو ان پر عائد کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے قرآن ماننے والوں کا فریضہ! غور کرو کہ اس کے لئے کس قدر وسیع اور عمیق سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کتنی کتنی بڑی معمل (LABORATORIES) درکار ہیں! تمہیں یاد ہے کہ اگلے دنوں جاوید تم سے پوچھتا تھا کہ ابا جان! اللہ میاں نے مچھروں کو کاہے کے لئے پیدا کر دیا ہے۔ یہ تو ہر ایک کو کاٹتی پھرتی ہیں اور بھلے چنگے آدمی کا منہ سجا دیتی ہیں بالآخر ان سے فائدہ کیا؟ ان کا فائدہ نہ تم بتا سکتے تھے نہ کوئی اور۔ لیکن اگلے دنوں جنوبی امریکہ سے ایک خبر آئی کہ وہاں ایک قسم کا کیڑا پیدا ہوتا ہے جو بعض قیمتی پودوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کا کوئی علاج ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر مسلسل مشاہدات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان کیڑوں کو مچھریں کھا جاتی ہیں۔ اب انہوں نے مختلف گرم ممالک سے مچھریں جمع کر کے انہیں اپنے ملک میں پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو علیٰ وجہ البصیرت پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ۔۔۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ۔۔۔۔ اے کائنات کے نشوونما دینے والے! تو نے مچھروں کو بھی تخریبی کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یہ بھی کائنات کی نشوونما میں تعمیری کام کرتی ہیں؛ سُبْحٰنَكَ ۔۔۔ یہ تجھ سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو تخریب کے لئے پیدا کر دے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بعید ہے۔ یہ تو ہمارے علم کی کمی، اور سائنٹیفک تحقیقات کا فقدان ہے جو ہم۔۔۔ ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر، فلہٰذا ان کی

زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان تحقیقات کی توفیق عطا فرما تاکہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ..... اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات (RESEARCHES) سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں، وہ تسخیرِ فطرت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ..... اور پھر ان ظالمین کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۱) تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اس آیت میں کتنی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔

بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کی رُو سے اُمتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جائیں۔ اسی کو

کائنات میں آیاتُ اللہ

قرآن نے ذکر و فکر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا اور ان میں غور و تدبر کرتے رہنا۔ یہی مومنین کا شعار تھا۔ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۵/۳) "مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیاتِ خداوندی بکھری پڑی ہیں۔" انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵/۴) "اور خود تمہاری تخلیق اور دوسرے حیوانات کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قانونِ خداوندی پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴۵/۵) "اور رات اور دن کی گردش میں، اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے اور ہر جاندار کے لئے نشوونما کا موجب بنتی۔ اور زمین مردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کرتی ہے۔ اور ان ہواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں، ان تمام مظاہرِ فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہے۔" ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد قرآن کریم ایک ایسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے جو بیک وقت موجبِ حیرت بھی ہے اور وجہِ بصیرت بھی۔ فرمایا: تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ..... یہ وہ آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۴۵/۶) "سو جو لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات پر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کونسی حقیقت ایسی آئے گی جس کی رُو سے وہ خدا پر ایمان لائیں گے؟" یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ہوتا تو پھر کوئی اور حقیقت ایسی نہیں رہ جاتی جس سے اسے ایمان نصیب ہو سکے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن مشاہدۂ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح اور عل وجہ البصیرت ایمان حاصل ہی اس سے ہوتا ہے۔ اسی سے "خدا بے نقاب

ہو کر سامنے آجاتا ہے۔"

میں نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے "خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے" تو یہ محض شاعری نہیں۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ایک آیت کا نہیں متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ذرا کان کھول کر سنو اور سوچو کہ قرآن نے چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ احکام خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے خدا مل جائے۔ اس کی اپنے رب سے ملاقات ہو جائے۔ اب دیکھو سلیم!

لِقاءِ رب

قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے۔ سورۂ رعد میں ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا..... ۝ (۱۳/۲) "اللہ کی ذات وہ ہے جس نے اس قدر عظیم کروں کو فضا کی بلندیوں میں بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے، اس حسن و خوبی سے بلند کر رکھا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ..... اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی..... اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقررہ راستوں پر ایک وقتِ معین تک کے لئے بلا چون و چرا چلے جا رہے ہیں۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ..... وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسنِ تدابیر سے چلائے جا رہا ہے۔ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ..... اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ (۱۳/۲) "تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کرو۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظامِ کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آجائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آسکتا ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو سطحِ بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لو گے کہ اس کا قانونِ رب العالمینی کس طرح کائنات کی نشوونما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آسکتا۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ..... ۝ (۶/۱۰۳) "انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔" اس لئے "لِقَاءِ رَبِّ" کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آسکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدے سے خدا کا نظامِ ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجاتا ہے۔ اور وہ اس کی رب العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

"لقاءِ رب" کا یقین انہی کو آسکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں۔ لیکن اس کے لئے بڑی جدّ و جہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے، اور کبھی بحرِ اطلانٹک کی گہرائیوں میں اترنا۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے۔ اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔ کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں دقتِ غور و تدبر و ہنا پڑتا ہے اور کبھی قطب شمالی کے برف پوش میدانوں میں بھٹکنا۔ کبھی شیروں کے منہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی ایک چیونٹی کی تشریح میں برسوں محوِ مطالعہ و مشاہدہ رہنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ وہی قومیں کر سکتی ہیں جو حاضر و موجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے: اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (۱۰/۶) "یقیناً دن اور رات کی گردش اور کائنات کی پہنائیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی نشانیاں ہیں"۔

متقی کون ہے

(ضمناً) تم نے غور کیا کہ خدا نے متقیوں کی کیا علامت بتائی ہے؟ اس کے بعد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ اس کے برعکس جو لوگ "ہماری ملاقات" کی توقع نہیں رکھتے۔ جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی۔ یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفاد، حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا۔ اور پیش پا افتادہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۱۰/۸) "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں"۔ پہلے تو اس بات پر غور کرو سلیم! کہ قرآن کریم نے: رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا اور وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا۔ سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ دنیا میں قوموں کی نکبت و زبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں جو اسی پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں جو انہیں آسانی سے میسر آ رہا ہو، وہ ندرتِ فکر اور معجزہ کارئ عمل سے محروم ہو کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں، بلکہ مسلسل محنت و مشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں۔ وہ اپنے لئے نئی نئی دنیائیں پیدا کرتی صفِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی قوتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامانِ ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ ... (۲۹/۲۳)

سامانِ ربوبیت سے محرومی

"جو لوگ ان آیاتِ خداوندی اور ملاقاتِ ربی سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامان نشوونما و ارتقاء سے محروم رہ جاتے ہیں" وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۲۹/۲۳) "یعنی یہ لوگ ایک دردانگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں"۔ تم نے دیکھا مسلیم! خدا کے سامانِ رحمت و ربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذابِ الیم کہا ہے۔ اسی کو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ یونس میں عذابِ نار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳/۱۹۱ - ۱۰/۸) یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ ذرا سوچو کہ حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہب سیال (LIQUID GOLD) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے تھے لیکن چونکہ وہ لوگ حاضر و موجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نانِ شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا۔ قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ ....○ (۱۶/۱۱۲) اس کے بعد اقوامِ مغرب کی نگاہِ خارا شگاف نے "پگھلے ہوئے سونے" کے ان دریاؤں کا سراغ پا لیا۔ اور اپنی مسلسل کوہ کنی سے انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود ہمارے خطۂ زمین (پاکستان) میں فطرت نے ممکنات (POTENTIALITIES) کی ایک دنیا چھپا رکھی ہے لیکن ہم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ہیں۔ اور ما تیسرہ (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پر شاکر اور قانع، اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ہے۔ لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ پیدا کرتے ہیں کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامانِ زیست برآمد کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانے کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں۔ ہم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ہے اس لئے ہم پر معیشت تنگ ہو رہی ہے؛ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا.... (۲۰/۱۲۴) خدا کا کھلا ہوا فیصلہ ہے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ مدتِ دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی ہیں اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو چکا ہے جن کے متعلق ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (۱۶/۱۰۸) "یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پر مہریں لگ چکی ہیں۔ یہ لوگ ہماری آیات سے بالکل بے خبر ہیں"۔

بعض کے نزدیک "لقاءِ رب" سے مراد یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے خدا کے سامنے جائے گا۔ اگرچہ سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہ مفہوم زیادہ موزوں نہیں لیکن اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ قرآن کی رو سے اس "لقاءِ رب" کے یقین کے لئے کائنات میں آیات اللہ کا مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور سزا و جزا ہمارے ایمان کا جزو ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ

(۱) علم وہی علم ہے جس میں انسان اپنے حواس سے کام لے۔

(۲) حواس سے کام لینے سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض کی پردہ کشائی کرے۔ اشیائے فطرت کا وسیع مشاہدہ کرے۔ قوانینِ فطرت کا گہرا مطالعہ کرے۔ اور مسلسل تجربات اور پیہم تگ و تاز سے خدا کے نظام و قوانینِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(۳) قوم مومنین کا یہی شعار ہے۔ گروہِ متقین کا یہی فریضہ ہے، یہی خدا کا ذکر ہے۔ اس سے چھپی ہوئی حقیقتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی انہی کائناتی آیات سے ملتی ہے۔ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ (۴۱/۵۳) یعنی ہم اپنی آیات عالمِ آفاق اور عالمِ انفس میں انہیں دکھاتے جائیں گے، تاآنکہ یہ بات ان کے سامنے ابھر کر آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی زمانے کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے حقائق جوں جوں انسانی علم و کاوش کے ہاتھوں کھلتے جائیں گے۔ قرآن کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاہداتِ فطرت اور علوم سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (انفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعیات (PHYSICS) ہی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ہیں، وہ بھی اُس کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ لیکن ان علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاہدات اور تجارب کی رو سے کی جائے گی۔ تاریخ، عمرانیات (SOCIALOGY) اور علمِ سائیکولوجی کو اس باب میں خاص اہمیت حاصل ہو گی۔ طبعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی رُو سے جوں جوں حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ..... اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ..... ۝ (۴۱/۵۳) قرآن، اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے خدا کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے۔ وہ ہر شے کا ہر وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اور یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا ٹھیک کہے گا۔ اس کا بیان علم و حقیقت پر مبنی ہو گا ظن و قیاس پر نہیں۔ اس لئے کہ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶) "قرآن، اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہے۔" لیکن جو لوگ کائنات کی ان

آیات سے بے خبر رہتے ہیں! انہیں درحقیقت "لقاءِ رب" کا یقین نہیں ہوتا۔ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۚ (۴۱/۵۴) حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کردیں تو انہیں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے اس لئے کہ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۚ (۴۱/۵۴) خدا کا قانونِ ربوبیت ہر شے کو محیط ہے۔ کسی ایک چیز کے ساتھ ہی وابستہ نہیں۔ اس لئے۔ ع

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تمہیں یاد ہوگا سلیم! میں نے تم سے ایک دفعہ ایک بڑی عمدہ کتاب کا ذکر کیا تھا جس کا نام تھا (THE GREAT DESIGN) اس کتاب کا پلان یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علوم کے ائمہ فکر و تحقیق کے پاس یہ سوالنامہ بھیجا گیا کہ آپ نے اپنے شعبۂ علم میں جس قدر تحقیق کی ہے، کیا اس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظامِ کائنات کسی خاص نظم و ضبط کے مطابق چل رہا ہے یا یونہی ہنگامی طور پر وجود میں آگیا اور ہنگامی طور پر چلے جا رہا ہے؟ اس سوال کے جو جوابات ان بڑے بڑے سائنسدانوں کی طرف سے موصول ہوئے انہیں بلا تنقید و تبصرہ محولہ صدر کتاب میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ ان جوابات کا احاطہ کس قدر وسیع ہے، اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک عالم نباتیات کے مقالہ کا عنوان ہے۔ "ایک سبز پتہ" اور علم الافلاک کے ایک عظیم ماہر نے "ستاروں کی گذرگاہوں" کے عنوان سے جواب لکھا ہے۔ ان میں ہر مفکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہمیں کائنات کے ذرّے ذرّے میں کسی علیم و حکیم کے مستحکم اور غیر متبدّل نظم و نسق کی کارفرمائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کائناتی نظم و ضبط کی یہی وہ کارفرمائیاں ہیں، جن کے سامنے ان ائمہ فکر و تحقیق کی نگاہ تحسین بشدّ قدم قدم پر جھک جاتی تھی۔ لیکن چونکہ ان کے سامنے قرآن نہیں، اس لئے وہ اس ہستی کے متعلق صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے جو اس نظام کو بایں حسن و رعنائی چلا رہی ہے۔ بایں ہمہ وہ اس کے نظامِ ربوبیت کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ (ان کے لئے اس مقام سے قرآن تک پہنچ جانا کچھ دشوار نہیں بشرطیکہ کوئی ان کے سامنے قرآن کو پیش کرنے والا ہو)۔

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رو سے علم کی تعریف کیا ہے۔ اس کے بعد اس نقطہ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رُو سے عالم کسے کہتے ہیں اور علماء سے کون لوگ

علماء کون ہیں؟

مراد ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا اعجاز دیکھو کہ اس نے اس حقیقت کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۚ (۳۵/۲۷) "کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ (۳۵/۲۷) اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید

جو (MAURICE BUCAILLE) کی معرکہ آرا کتاب (THE BIBLE, THE QURAN & SCIENCE) شائع ہوئی ہے تو اکثر قرآنی حقائق درخشندہ ستاروں کی طرح ضوفشاں ہوگئے ہیں۔ (۱۹۸۱ء)

طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں۔ اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط ..... اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ ان آیات میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے، کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم کا۔ طبعیات (PHYSICS) نباتیات (BOTANY) طبقات الارض (GEOLOGY) حیوانیات (ZOOLOGY) اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا حقیقت یہ ہے کہ ... خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ($\frac{35}{27 - 28}$) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ "خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح ایسے عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے"۔ تم نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہی کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنسٹ کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ) لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں وہی لا سکتا ہے جو ان قوانین سے واقف ہو جن کے مطابق یہ قوتیں کارفرما ہیں۔ یہ قوانینِ فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ہیں انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ہے۔

ہمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف (DEFINITION) کے بعد تم غور کرو سلیم! کہ ہمارے ہاں جو حضرات علماء کہلاتے ہیں انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ہوتا ہے۔ وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کا علم نظری مباحث اور لفظی کٹ حجتیوں سے ایک قدم آگے نہیں جاتا۔ اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں نہ کائنات سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ہمارے مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تمام عرصہ منطق۔ فلسفہ۔ معانی۔ بیان۔ ادب۔ نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور منطق و فلسفہ بھی وہ، جو اب عہدِ پارینہ کی داستان بن چکا ہے۔ اس نصاب میں ہیئت، ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا۔ اور تو اور راقم حیران ہو گئے کہ ان کے نصاب میں قرآنِ کریم بھی داخل نہیں ہوتا۔ تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ہے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مترادفات دیئے گئے ہیں۔ اور آخری سال سورۂ بقرہ کی تفسیر بیضاوی۔ بس یہ ہے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے۔ اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب ہندوستان میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال شروع ہوا ہے تو "علمائے کرام" سے اس کے جائز اور ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔ اس فتویٰ کے جواب میں جمعیتہ العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا کہ

جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا

> آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رُخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے۔ (بحوالہ نقیب ۱۱/۱۴ ۱۰۱)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔ لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے بہت بڑے مفتی محمد شفیع صاحب نے (جو بعد میں پاکستان تشریف لے آئے تھے) اس کے خلاف فتویٰ شائع کیا جس میں "عباداتِ مقصودہ" کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا[1]۔ انہوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام المدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے اس کے لئے انہوں نے انگلش مڈل اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ

> برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔

چنانچہ اس تحقیقِ انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو حرام قرار دیدیا۔ یعنی ماسٹر برج نندن صاحب کے قیاس کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسولؐ کا اس باب میں یہ حکم ہے۔ تم نے غور کیا کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علومِ جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے حرام و حلال ہونے کے متعلق فتوے صادر ضرور کرتے رہتے ہیں۔ اور اب پاکستان میں معاملہ فتاویٰ کی حد سے بڑھ کر قانون سازی تک پہنچ گیا ہے۔ مثلاً اگر اب یہ معاملہ حکومت کے سامنے آجائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہو تو ان حضرات کا مطالبہ[2] ہے کہ یہ قانون یہ حضرات مرتب کریں گے۔ یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ سپیکر ہوتا کیا ہے۔ اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بنا پر اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب و سنت جائز ہے یا ناجائز۔ اور یہ فیصلہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مومنین، متقین، خدا کا ذکر کرنے والے، "لقاءِ ربّ" کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہ ہیں جو کائناتی نظام پر غور و فکر کرتے اور اشیائے قوائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جد و جہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رُو سے علم ہے۔ اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس بنا پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن اور متقی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعتِ مومنین اور گروہِ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کرلے،

---

[1] اب یہی علمائے کرام لاؤڈ سپیکر کو نماز اور خطبات میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔
[2] اب عملاً ایسا ہو رہا ہے۔ (سنہ ۱۹۸۱ء)

مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن اور متقی وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد، فطرت کی قوتوں کو ان قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں درج ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں۔ یعنی

(۱) تسخیرِ فطرت' اور

(۲) اس کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔

اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ مومن اور متقی نہیں ہو سکتی۔ قرآن اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً... ۝ (۲/۲۰۸) کا حکم دیتا ہے۔ یعنی قرآن کے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر وارد کرنے کا حکم۔ ہم مومن اور متقی نہیں کیونکہ ہم میں شرطِ اوّل (تسخیرِ فطرت) کی کمی ہے۔ (اور جب ہم شرطِ اوّل کو (تسخیرِ فطرت) ہی پوری کرتے ہیں تو شرطِ دوم (قوائے فطرت کا قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اقوامِ مغرب مومن اور متقی نہیں، کیونکہ ان میں شرطِ دوم کی کمی ہے۔ لہٰذا ایمان و تقویٰ کی عملی سطح پر وہ اور ہم دونوں یکساں ہیں۔ لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انہوں نے تسخیرِ فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنا لیا ہے۔ اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے کیونکہ یہ قوانینِ خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔ یہی وہ اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ... ۝ (۳/۶) ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ... مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴) "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ... مومن نہیں کافر ہیں۔" اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے۔ (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حشر ہو رہا ہے)۔ وہ لوگ سائنس کا اس قدر وسیع علم رکھنے کے باوجود انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کر پاتے۔ یعنی اس باب میں ان کا سمع و بصر و فواد انہیں کچھ کام نہیں ..... دے رہا۔ قرآنِ کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً... ۝ (۴۶/۲۶) ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکّن عطا کیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکّن عطا نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سمع و بصر و فواد بھی عطا کیا تھا۔ لیکن؛ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ... ۝ (۴۶/۲۶) "لیکن جب انہوں نے ان قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسول کی وساطت سے انہیں ملے تھے تو ان کی سمع و بصر و فواد انہیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آ سکا۔" اگر اقوامِ مغرب کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے، اُس جنّت میں

تبدیل ہو جائے جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ دیکھو سلیم! اس حقیقت کو قرآن کیسے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ تم سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لاؤ جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انہیں یونہی میسّر آجاتا ہے، اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں: اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ..... ۝ (۱۰/۸) "یہ لوگ جہنّم میں رہتے ہیں"۔ اس کے بعد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۝ (۱۰/۹) جو لوگ ان کے برعکس آیاتِ خداوندی پر یقین رکھتے ہیں، اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ..... ان کا نشو و نما دینے والا ان کے اس ایمان کی بنا پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ..... ۝ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان..... باغات میں رہتے ہیں، جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ..... اس جنتی معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آجاتی ہے کہ بارالٰہا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا۔ وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ..... اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق..... آرزوئیں بڑی حیات بخش اور سلامتی افروز ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے اس معاشرہ کو قائم کیا وہ مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و عمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے۔ تا آنکہ آخر الامر یہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے۔ اُس وقت ہر دیکھنے والا پکار اُٹھے گا کہ خدا کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۱۰/۱۰) یہ نتیجہ ہوتا ہے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرفِ آخر

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآنی خطوط پر تشکیل کرنا چاہیں، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم اس قسم کے ریسرچ سکالرز اور سائنسدان (SCIENTISTS) پیدا کریں جو انفس و آفاق کے ہر شعبے میں قوانینِ فطرت کے مشاہدات و تجربات سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے جائیں۔ اور اس کے ساتھ وہ قوانینِ خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اس طرح عام کئے جائیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو ان قوانین کے مطابق تقسیم اور استعمال کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی رُو سے علماء کہا جائے گا۔ جب تک "علم اور علماء" کے متعلق ہمارا موجودہ تصوّر نہیں بدلتا، خدا تک پہنچنا تو ایک طرف، ہم زندہ قوموں کے زُمرے میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ ؎

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی